جلد ۱۰۴ اکتوبر ۱۹۸۵ء عدد ۲

ماہنامہ

ترجمان القرآن

مؤسس

مولانا سید ابوالاعلیٰ مودودی رحمہ اللہ تعالیٰ

ادارۂ ترجمان القرآن اچھرہ لاہور

سفینۂ نجات

از

مولانا جلیل احسن ندوی

کا نیا ایڈیشن

طبع ہو کر آگیا ہے تاجران کتب
اور قارئینِ کرام اپنی مطلوبہ تعداد
کے لیے پہلی فرصت میں اپنے
آرڈر سے مطلع فرمائیں۔

سائز ۱۸ × ۲۳ / ۸ خوبصورت کور

قیمت: ۲۸/۵۰ روپے

مولانا مودودی کے سیاسی افکار

از

عبد الکریم عابد

کا نیا ایڈیشن

طبع ہو کر آگیا ہے تاجران کتب
اور قارئینِ کرام اپنی مطلوبہ تعداد
کے لیے پہلی فرصت میں اپنے
آرڈر سے مطلع فرمائیں۔

سائز ۱۸ × ۲۳ / ۸ خوبصورت کور

قیمت: -/۲۴ روپے

ادارہ ترجمان القرآن لمیٹڈ۔ لاہور

رحمان مارکیٹ۔ غزنی سٹریٹ۔ اردو بازار

ترجمان القرآن لاہور

فہرست مضامین

جلد ۱۰۴ — اکتوبر ۱۹۸۵ء مطابق صفر ۱۴۰۶ھ — عدد ۲

ماہنامہ ترجمان القرآن لاہور

۵ - اے ذیلدار پارک، اچھرہ، لاہور

زر سالانہ تیس روپے - فی پرچہ ۳/- روپے

سید حسین فاروق مودودی نے ایچ فاروق ایسوسی ایٹس لمیٹڈ لاہور سے چھپوا کر دفتر ترجمان القرآن اچھرہ لاہور سے شائع کیا۔

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

اشارات

آج جب کہ میں یہ اشارات لکھنے بیٹھا ہوں، ماہ محرّم کا آغاز ہے جس کی پہلی تاریخ کو سیّدنا حضرت عمر رضی اللہ عنہ کی شہادت واقع ہوئی، اور یہی ماہ محرّم ہے جس کے عشرۂ اوّل کا اختتام حضرت امام حسین رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی شہادت سے ہوا۔ حضرت سیّدنا عمر رضی اللہ عنہ دوسرے خلیفۂ رسول اللہ صلّی اللہ علیہ وسلّم خلافت علیٰ منہاجِ نبوت کا کام حسن و خوبی سے چلاتے ہوئے ابولولو فیروز نامی ایک مجوسی کے جذبۂ انتقام (جس کے پیچھے ایک سازش کا سراغ بھی ملتا ہے) کا ہدف بن گئے۔ یہ واقعہ انتہائی درد انگیز ہے اور اس کی یاد تازہ رہنی چاہیے۔ مگر امام حسین رضی اللہ عنہ کو دوسری ہی نوعیت کا مقام ملا۔ یعنی جب کاروبارِ سیاست و حکومت کی گاڑی کو خلافت علیٰ منہاجِ نبوت سے ہٹا کر قیصری و کسروی بادشاہتِ جبر کے راستے پر ڈال دیا گیا تو اس تیز رو گاڑی کو روکنے کے لیے امام حسین رضی اللہ عنہ اس سے بے پروا ہو کر سامنے جا کھڑے ہوئے کہ دونوں طرف قوت کا تناسب کیا ہے۔ اس لحاظ سے واقعۂ کربلا ایک خاص اہمیت کا حامل ہے اور مسلمان اس واقعہ کی یاد بڑے پُرجوش طریق سے تازہ کرتے ہیں۔

یاد تو تازہ کی جاتی رہتی ہے، مگر آہستہ آہستہ یہ تصوّر گم ہوتا گیا کہ ہم کس بات کی یاد تازہ کرتے ہیں۔

وہ قومیں بڑی خوش نصیب ہوتی ہیں، جو اپنی تہذیبی شناخت سے محروم نہیں ہوتیں جن کی تاریخ رزمِ خیر و شر کی آئینہ دار ہوتی ہے اور جن کے بنیادی عقیدوں اور مقاصد کو شاداب کرنے

کے لیے شہادت کی گھٹائیں وقتاً فوقتاً اُٹھ کر خون کی برکھا لاتی رہتی ہیں اور نخیل دخش کی جڑیں بار بار سرسبز ہو کر نئے شگوفے چھوڑتی اور نئے برگ و بار سے آراستہ ہوتی ہیں۔

اگر کسی گروہِ انسانی کی تاریخ کا تمام تر سرمایہ فاتحین کی جنگوں، کمزوروں پر چڑھائیوں، بادشاہوں کے جاہ و جلال کے مظاہروں، درباریوں کی سازبازکی روئیدادوں اور ان کے ساتھ کچھ اتفاقی حادثات و تغیرات کا ریکارڈ ہو تو ایسی قوموں کی نہ ایمانی و اخلاقی بنیادیں ہوتی ہیں اور نہ اُن کے ہاں انسانیت کی اعلیٰ اقدار کو جگمگاہٹ ملتی ہے۔ جن قوموں کی داستانیں فقط لوٹ مار اور مفاد کے ٹکراؤ کی داستانیں ہوں اور جن کے ماضی و حال کا سارا تانا بانا نسلیت اور وطنیت کے تاروں سے بُنا ہو ان کی تہذیب، دولت، سامانِ تعیش، لذتی ثقافت، جنسی جنون اور ان کے تحفظ کے لیے سامانِ جنگ کی ترقیات سے عبارت ہوتی ہے۔ ان کے ہاں تعلیم، علم، ادب، صحافت فنون، سائنس اور ٹیکنالوجی کی تمام تر ترقیات بھی متذکرہ اغراض کے لیے مطلوب ہوتی ہیں۔

ہم مسلمان، بہ حیثیت ایک عالمگیر ملت کے اس لحاظ سے خوش نصیب ہیں کہ ہزار تباہیوں اور پستیوں کے باوجود ہمارے ایمانی وجود اور ہماری تہذیبی ہستی کی جڑیں سلامت و سرسبز ہیں، جو نہ صرف زمہریری موسم اور لُو کے جھکڑوں میں بھی نئی کونپلیں نکال لیتی ہیں۔ یہ جڑیں اسی لیے سرسبز ہیں کہ ہمارے اندر ایک مفاد پرست قوم اور ایک اخلاقی تہذیب کی امانت دار قوم ہونے کا احساس باقی ہے یہ احساس اس لیے باقی ہے کہ امام حسین رضی اللہ عنہ نے اُمت کے ضمیر کو زندہ رکھنے کے لیے جس طرح اپنا خون پیش کیا تھا، اسی طرح امام مالکؒ، امام ابو حنیفہؒ، حضرت امام احمد بن حنبلؒ نے بھی قربانیاں دیں۔ اور پھر قریب کی تاریخ میں وسط ایشیا کے مسلمانوں کی جانبازیاں، مغربی امپریلزم کے مقابلے میں عرب اور مسلم افریقی علاقوں کی تحریکوں کے کارنامے، خود برصغیر میں تحریک مجاہدین اور ۱۸۵۷ء کی تحریک آزادی کے شہدا و ستم رسیدگان کا ایثار عظیم، مصر، سوڈان اور شام میں اخوان المسلمون کی سرفروشیاں یہ سب ایک ہی سلسلے کی کڑیاں ہیں۔ اور ان پچھلے واقعات کا شعور ہمارے لیے اس وجہ سے ضروری ہے کہ یہ سلسلہ قیامت تک ٹوٹنے نہ پائے۔

محرم میں امام حسینؓ اور کربلا کی داستان کی تفصیلات مختلف نقطہ ہائے نظر سے لکھی بھی جائیں گی اور مجالس میں سنائی بھی جائیں گی۔ طرح طرح کے محرکات اور مقاصد بیان کیے جائیں گے۔ ہم پوری کہانی کو یہاں عرض نہیں کر رہے۔ ہم صرف یہ چاہتے ہیں کہ امام کے اپنے ہی ارشادات سے جو کچھ سبق ملتا ہے وہ اخذ کیا جائے۔

سب سے مختصر لفظوں میں امامؓ نے اپنا مقصد عبداللہ بن مطیع کے سامنے بطنِ رملہ سے کچھ آگے جاکر بیان کیا۔ عبداللہ نے پوچھا:

"آپ حرم سے کیوں نکلے"؟

جواب دیا:

"کوفہ والوں نے بلایا ہے کہ معالمِ حق کو زندہ کیا جائے اور بدعتوں کو مٹایا جائے"۔

یعنی دین کی اصل سچائیاں اور معروفات قائم کیے جائیں اور بدعات (مخالفِ سنّت طریقوں) کو ختم کیا جائے۔ ان الفاظ سے مراد وہی کچھ ہے جو امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کے قرآنی تقاضے سے ہے۔ یہ فریضہ ہر مومن و مسلم اور بہ حیثیت مجموعی پوری امت اور اس امت سے تعلق رکھنے والے ہر ادارے اور گروہ پر عاید ہوتا ہے۔

اس فریضہ کے مختلف مدارج ہیں، زبانی دعوت سے لے کر جہاد تک کے سارے مراحل کو یہ محیط ہے۔ مگر یہ فیصلہ کرنا کہ کیسا منکر سامنے ہے؟ اس کے ازالے کی کیا صورت ممکن ہے؟ اور کسی خاص قسم کی صورتِ حالات میں کیا اقدام کرنا چاہیے؟ ان سارے سوالات کا فیصلہ اس فرد یا گروہ کو کرنا پڑتا ہے جو ایک خاص سلسلۂ تاریخ کی راہ پر چلتا ہوا، کسی خاص طرح کے احوال و ظروف میں گھر جائے۔ ایسے کسی لمحے کا تقاضا بسا اوقات اعلیٰ درجے کی عزیمت ہوتا ہے۔ اور عزیمت کے تقاضوں سے کترا کر نکل جانے سے عامۃ الناس کے ایمان و ضمیر ٹھٹھر جاتے ہیں۔ اور خودی کا اُبھار ختم ہو جاتا ہے۔

یہ واضح ہے کہ امام حسینؓ "کوفہ والوں کی کوفیت" سے آگاہ ہونے کے بعد لڑنا نہیں چاہتے تھے۔ اُنہوں نے واپس ہونا چاہا، انہوں نے سرحدوں کی طرف نکل جانے کی خواہش کی، انہوں نے یزید کے سامنے جاکر بالمشافہ بات کرنے کا عندیہ ظاہر کیا، مگر ان کو معاند قوتوں نے

چاروں طرف سے گھیر کر اور مجبور کر کے مقامِ جنگ تک پہنچا دیا۔ اب ایک ہی شرطِ نجات باقی رکھی گئی کہ یزید کی حکومت کے حق میں بیعت فرمالیں۔ حضرت امامؓ جن کے ساتھ اہل وعیال تھے یا چند گنے چنے دیوانے، انہوں نے اس شرطِ نجات کو قبول کرنے کے بجائے کثیر التعداد دشمنوں کے تیروں اور نیزوں کا اپنے آپ کو اور اپنے مختصر سے قافلے کو نشانہ بننے کے لیے پیش کر دیا، مگر قلتِ قوت کے باوجود آخری سانس تک جہاد کی بازی مردانہ وار کھیلے۔

ایسے چیلنج کے سامنے آنے کے بعد اگر معاملہ ذرا بھی دب کر کیا جاتا تو اُس وقت معاشرے پر بُرے اثرات پڑتے، ان کے علاوہ اُمت کی نسلیں ایک قابلِ فخر تاریخی میراث سے محروم رہ جاتیں۔

امامؓ کے سامنے دراصل وہ بُرے اثرات تھے جو سبائی، مجوسی اور یہودی سازشوں، مسلمانوں کی داخلی آویزشوں، بیعت بہ زور و زر اور بادشاہتی مظالم کی وجہ سے معاشرے کو اپنی لپیٹ میں لے چکے تھے۔ اور جن کی وجہ سے ضمیر خوف اور مفاد کے دوہرے بوجھ تلے دب گئے تھے۔ امامؓ نے آخری بازی کھیلنے کا فیصلہ غالباً اس لیے کیا کہ سُن ہو جاتے والے ضمیروں میں آئندہ زندگی کروٹ لے سکے۔

بہرحال مقصد امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کا تھا۔

بطنِ عقبہ سے گزر کر جب قافلہ شراف میں اُترا تو وہاں حکومت کی طرف سے حُر بن تمیمی بھی ایک ہزار سواروں کے ساتھ پہنچا۔ قیام کے بعد جب وہاں سے امام کا قافلہ آگے روانہ ہونے لگا تو امام حسینؓ نے یہ باتیں کہیں:

"ہم اہل بیت خلافت کے ان دعوے داروں کے مقابلے میں، جنہیں اس کا کوئی استحقاق نہیں اور جو تم پر ظلم و زیادتی کے ساتھ حکومت کرتے ہیں، خلافت کے حقیقی مستحق ہیں۔"

اس کلام میں پہلی اہم بات یہ ہے کہ حضرت امام حکومت کے اسی طرزِ خلافت کے علمبردار تھے جو نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی وفات سے لے کر نئے دَورِ انحراف سے پہلے تک چلتا رہا تھا۔ کم سے کم

بہر نہ کسی جداگانہ قسم کے نظام امامت کی بات سامنے نہیں آتی۔

دوسری قابل توجہ بات یہ ہے کہ اگر یہ امام حسینؓ گفتگو میں یہ کہتے ہیں کہ ہم اہل بیت خلافت کے زیادہ مستحق ہیں، لیکن یہاں اہل بیت ہونے کا تذکرہ وہ بطور اپنے ایک ایمانی و اخلاقی اعزاز کے کر رہے ہیں، نہ یہ کہ اسے دلیلِ استحقاق قرار دیا۔ اگر امام اپنے "اہل بیت" ہونے کو دلیل استحقاق قرار دیتے تو خلافت کے غیر مستحق دعوے داروں کے بارے میں بجائے یہ بات کہنے کے "جو تم پر ظلم و زیادتی کے ساتھ حکومت کرتے ہیں" زیادہ قرینِ حقیقت یہ کہنا ہوتا کہ وہ لوگ اہل بیت میں سے نہیں ہیں۔ امامؓ نے اصل چیز یہ واضح کی کہ آج کے نام نہاد مدعیانِ خلافت تم پر ظلم و زیادتی سے حکومت کر رہے ہیں، ان کے بجائے اگر حکومت ہمارے ہاتھ میں ہوتی تو عدل و رحمت کا صدور ہوتا۔

اس ارشاد میں یہ نظریہ بھی شامل ہے کہ اسلامی نقطۂ نظر سے ظلم و زیادتی کرنے والوں کو حکومت کرنے کا استحقاق نہیں ہے۔

یوں تو عربوں میں یہ روایت بھی تھی کہ مخالفوں کے سامنے اپنے ذاتی یا خاندانی فضائل بیان کرتے تھے۔ پھر حضرت سیدنا عثمان غنی رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے شورش پسندوں سے آخر میں جو خطاب کیا اس میں انہوں نے بھی اپنے دینی مرتبے کا اور خدمات کا نہیں احساس دلایا۔ یہ چیز بربنائے مفاخرت نہ تھی بلکہ اپیل کے طور پر تھی۔ امام حسینؓ نے بھی مخالفین کے اچھے جذبات کو اپیل کے ذریعے متحرک کرنے کی کوشش کی۔

یہ نہ مانا جائے تو پھر امامؓ کے متعلق گویا تاثر یہ ہوا کہ وہ موروثی اقتدار کے نظریے کے علمبردار تھے۔ حاشا و کلّا ایسا نہیں تھا۔

بعد میں اسی اپیل کے انداز سے شبِ عاشورہ گزرنے پر صبح کو دُعا کرنے کے بعد دشمنوں کو مخاطب کرتے ہوئے قدرے تفصیل سے کلام کیا۔ فرمایا:

" لوگو! میرے نسب پر غور کرو، میں کون ہوں، پھر اپنے گریبانوں میں منہ ڈال کر اپنے آپ کو ملامت کرو۔ خیال کرو کہ میرا قتل اور میری آبروریزی یعنی میری

عزت پر حملہ کرنا) تمہارے لیے زیبا ہے؟ کیا میں تمہارے نبیؐ کی بیٹی کا لڑکا نہیں ہوں اور اس کے وصی ابن عم، خدا پر سب سے پہلے ایمان لانے والے، اس کے رسولؐ اور اس کی کتاب کی تصدیق کرنے والے کا فرزند نہیں ہوں؟ کیا سید الشہدا حمزہؓ اور جعفر طیار میرے چچا نہ تھے؟ کیا تم کو نہیں معلوم نہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے میرے اور میرے بھائی کے متعلق فرمایا کہ یہ دونوں نوجوانانِ جنت کے سردار ہیں۔"

اور یہ بھی فرمایا:

"مجھے بتاؤ کہ تم لوگ میرے خون کے کیوں خواستگار ہو؟ کیا میں نے کسی کو قتل کیا ہے؟ کیا کسی کا مال ضائع کیا ہے؟ کسی کو زخمی کیا ہے؟

اوپر کی عبارت پر غور کریں، اس میں اپنے نسبی وحسبی مرتبے کے بیان کا صاف مقصد یہ احساس دلانا ہے کہ میں کوئی ایسا آدمی نہیں جو یکایک زمین سے نکل آیا ہو۔ پردیس سے یہاں آداخل ہوا ہو، کسی غار سے پہلی مرتبہ نمودار ہوا ہو، جس کا کوئی مقام عزت نہ ہو، جو اسلامی معاشرے کے کسی گوشے میں گمنامی میں پڑا رہا ہو، جسے تربیت کے لیے اچھا خاندانی ماحول نہ ملا ہو، جس کی پہلے سے کوئی قدر وقیمت نہ ہو۔ بخلاف اس کے میں خانوادۂ نبوت کا پروردہ وہ نوجوان ہوں جس کی فضیلت احادیث میں وارد ہے۔ چاہیے تھا کہ تم مجھے پہچانتے اور میرا پیغام سمجھتے۔ اگر یہ نہیں تو اتنا تو تمہیں سوچنا چاہیے کہ میرا قتل اور میری عزت پر حملہ کرنا تمہارے لیے کسی طرح جائز نہیں ہے۔ یہ چیز تب جائز ہوتی کہ میں کوئی قتل کرتا، کسی کا مال ضائع کرتا یا کسی کو زخم لگاتا۔ میرا ایسا کوئی جرم نہیں ہے تو پھر تمہارا یہ عناد کیا جواز رکھتا ہے؟

یہاں نہ تو نسب کو اور خاندان کو مطالبۂ اقتدار کی دلیل کے طور پر پیش کیا گیا ہے اور نہ فخر وغرور کے کسی اظہار کے لیے۔ بعض ہستیوں کی عظمتیں اتنی نمایاں ہوتی ہیں کہ انہیں اپنے قدر بڑھانے کے لیے کبھی ان کو اپنی زبان سے بیان کرنے کی ضرورت محسوس نہیں ہوتی۔ یہاں مقصد حکومتی لشکر کے عوام کے فکر اور جذبات کو اپیل کرکے متحرک کرنا مقصود ہے۔

مقامِ بیضہ پر حضرت امام نے ایک اور پُرجوش خطاب کیا۔ فرمایا:

"لوگو! رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ جس نے ظالم، محرماتِ الٰہی کو حلال کرنے والے، خدا کے عہد کو توڑنے والے، سنّتِ رسولؐ کے مخالف اور خدا کے بندوں پر گناہ اور زیادتی سے حکومت کرنے والے بادشاہ کو دیکھا۔ اور اُس کو قولاً اور عملاً غیرت نہ آئی تو خدا کو حق ہے کہ اُس کو اس بادشاہ کی جگہ دوزخ میں داخل کرے۔ ان لوگوں نے شیطان کی اطاعت اختیار کی اور رحمٰن کی اطاعت چھوڑ دی ہے۔ مُلک میں فساد پھیلایا ہے۔ حدودِ الٰہی کو بے کار (یعنی معطل) کر دیا ہے۔ مالِ غنیمت میں اپنا حصّہ زیادہ لیتے ہیں، خدا کی حرام کی ہوئی چیزوں کو حلال کر دیا ہے اور حلال کی ہوئی چیزوں کو حرام کر دیا ہے۔ اس لیے مجھ کو غیرت آنے کا زیادہ حق ہے۔"

اس تقریر میں برسرِ اقتدار قوت اور اس کے حامیان کے خلاف الزام یہ ہیں کہ:

۱۔ ان لوگوں نے شیطان کی اطاعت اختیار کی۔ ۲۔ رحمٰن کی اطاعت چھوڑ دی۔ ۳۔ مُلک میں فساد پھیلایا۔ ۴۔ حدودِ الٰہی کو معطل کر دیا۔ ۵۔ مالِ غنیمت میں ناجائز تصرف کیا۔ ۶۔ خدا کی حرام کردہ چیزوں کو حلال کیا۔ ۷۔ خدا کی حلال کی ہوئی چیزوں کو حرام کیا۔

یہ ساری باتیں قرآن و سنّت کے عین مطابق ہیں اور اس میں نہ اُمت سے کوئی جداگانہ کلامی رنگ ہے اور نہ کسی طرح کی نئی اور علیحدہ اصطلاحات ہیں۔

بالفاظِ دیگر نظامِ خلافت کی بحالی اور نفاذِ شریعت حقہ کا جذبہ تھا۔ جس کا اظہار امام کے متذکرہ خطبے میں ہوا۔

قیس بن اشعث کو جواب دیتے ہوئے فرمایا:

"خدا کی قسم! میں ذلیل کی طرح اس کے ہاتھوں میں ہاتھ نہ دوں گا اور غلام کی طرح اس کا (یعنی اس کی حکمرانی کا) اقرار نہیں کروں گا۔"

مطلب واضح ہے کہ لشکر کے دباؤ سے میں ذلت کی راہ اختیار کر کے ایک غلط حاکم کی بیعت

کرنے پر تیار نہیں ہوں۔ اور نہ ان کی حکومت کے جواز کا غلامانہ انداز سے اقرار کر سکتا ہوں۔

شبِ عاشورہ کو جب بہن زینب رضی اللہ تعالیٰ عنہا بہت بے قابو ہو کر رو دیں تو آپ نے ان سے فرمایا:

"میں تم کو خدا کی قسم دلاتا ہوں کہ اگر میں مر جاؤں تو اسوۂ رسول ؐ کے خلاف نہ کرنا، میری موت پر گریبان نہ پھاڑنا، منہ نہ نوچنا اور بین نہ کرنا۔"

یہ وصیت بے حد اہم ہے اور ہم مسلمانوں کو اسے اپنے ذہنوں میں تازہ کرنا چاہیے۔

اجمالاً ہم نے یہاں امام حسین رضؓ کے پیغام اور مقصدِ قربانیٔ کربلا کو بیان کر دیا ہے۔ امید ہے کہ یہ مختصر سی تحریر اہلِ ایمان کے لیے باعثِ افادہ ہوگی۔

جاننا چاہیے کہ آج جب کہ دنیا کی طاغوتی قوتیں محض مقتدر اشخاص اور حاکم خاندانوں تک محدود نہیں رہ گئی ہیں۔ بلکہ یہ بدیت عالمگیر قوتوں کی صورت میں وہی سارے کام کر رہی ہیں، جن کے خلاف حضرت امام حسین جان کی بازی لگانے اٹھے تھے۔ جبر سیاسی بھی، معاشی بھی، سفارتی بھی اور جنگی بھی، ہر طرف کارفرما ہے، فحاشی و عیاشی کا سیلاب اُمڈ رہا ہے۔ جھوٹے اور فریبکارانہ پروپیگنڈے کا طوفان برپا ہے، خدا کے حرام کردہ امور کو حلال اور حلال کردہ کو حرام کر دیا گیا ہے۔ شیطان کی اطاعت ہو رہی ہے اور رحمٰن سے بغاوت، بر و بحر میں فساد ہی فساد ہے، زمین خوف کی بے شمار اقسام سے بھر گئی ہے، حدودِ الٰہی معطل ہی نہیں، ان کے خلاف عقلی حملوں کے علاوہ طنز و تضحیک کے وار بھی ہو رہے ہیں۔ انسانی معاشروں کے اموال میں ہر جگہ تصرفِ بے جا ہو رہا ہے۔ خود مسلمان ممالک میں خدا کے عہد کو توڑنے اور سنّتِ رسول ؐ کی مخالفت کرنے میں اربابِ جاہ و مال اور اصحابِ فکر و دانش کے ساتھ عوام بھی شریک ہیں۔ ہمارے اردگرد اتنا بڑا میدانِ کربلا پھیلا ہوا ہے اور اس سے کبھی کبھی آواز آتی ہے۔

"ایک حسین بھی نہیں"

غلاظت کے اس طوفانی سمندر کی موجوں اور گردابوں میں گھرے ہوئے سچے مسلمانوں کا کام

یہ ہے کہ باہم مل کر اور قوتیں جمع کر کے اس عذاب سے باہر نکل کر کسی جزیرۂ سلامتی تک پہنچنے کی راہ نکالیں۔ نہ یہ کہ موجوں کے تھپیڑے کھاتے ہوئے وہ آپس ہی میں لڑنے لگیں۔[لہ]

دعا ہے کہ یہ زمانۂ محرم خیریت سے گزرے اور مسلمان امام حسینؓ کی قربانی کے صحیح مقصد اور ان کے دیئے ہوئے پیغام کو سمجھیں۔

ایک ضروری وضاحت :

چونکہ یہ اشارات مجھے ایک ہی دن میں لکھنے تھے اس لیے کسی لمبی چوڑی تحقیق کا موقع نہ تھا۔ مذکورہ حوالے میں نے سیر الصحابہ جلد ۶ (شائع کردہ دار المصنفین) سے لیے ہیں۔

لہ امام حسینؓ کا قائم کردہ نمونہ یہ ہے کہ انہوں نے ساتھ نہ آسکنے والوں کے عذر سن کر بھی ملامت نہیں کی اور ساتھ آنے والوں کو یہ دیکھ کر کہ اب فتح و شکست کا معاملہ نہیں بلکہ سارا کھیل محض جانیں دینے کا ہے، واپس جانے کی بار بار ترغیب دلائی اور جو چلے گئے ان کے ایمان یا کردار کے خلاف کوئی سخت لفظ استعمال نہیں کیا۔ یہ تو بعد کے لوگ ہیں جنہوں نے جس کے متعلق جو چاہا کہہ دیا۔ اور اسی سے نزاعات پیدا ہوتے ہیں۔

اجماعِ اُمّت

شیخ الحدیث جناب عبدالمالک صاحب ـ منصورہ ـ لاہور

(۳)

اجماع سکوتی کی صورت یہ ہے کہ اہل حل و عقد (مجتہدین) میں سے کوئی کسی ایک زمانے میں کسی ایک مسئلہ میں ایک حکم کو اختیار کرے اس سے پہلے کہ اس مسئلہ میں مذاہب قائم ہو چکے ہوں۔ اور یہ چیز زمانے کے علماء میں پھیل جائے اور اس میں غور و فکر کی مدت گزر جائے اور کسی نے اس سے اختلاف نہ کیا ہو تو یہ احناف کے نزدیک قطعی اجماع ہوگا۔ قول (بلانکیر) کی طرح فعل (بلانکیر) کا بھی یہی حکم ہے۔

اجماع کی پہلی صورت کو عزیمۃ اور اصل اجماع قرار دیا جاتا ہے اس لیے کہ اس کا اجماع ہونا نطق اور صراحت سے ثابت ہوتا ہے۔ اور دوسرے اجماع کو اس ضرورت کی بنا پر اجماع قرار دیا جاتا ہے کہ سکوت کو اتفاق نہ قرار دیا جائے تو لازم آئے گا۔ سکوت عن الحق اور یہ فسق ہے۔ جو عصمت امت کے منافی ہے علامہ ابن تیمیہ اس کے بارے میں فرماتے ہیں:

"واما اقوال الصحابة فان انتشرت ولم تنكر في زمانهم فهي حجة عند جماهير العلماء وان تنازعوا رد ما تنازعوا فيه الى الله والرسول ولم يكن قول بعضهم حجة مع مخالفة بعضهم له باتفاق العلماء وان قال بعضهم قولا ولم يقل بعضهم بخلافه ولم ينتشر، فهذا فيه نزاع وجمهور العلماء يحتجون به كابي حنيفة ومالك واحمد في المشهور عنه والشافعي في احد قوليه وفي كتبه الجديد الاحتجاج بمثل ذالك في غير موضع لكن من الناس من يقول هذا هو القول القديم"۔

(اقوالِ صحابہ پھیل جائیں اور ان کے زمانہ میں ان پر انکار نہ کیا جائے تو یہ علماء کے مختلف طبقوں کے جماہیر کے نزدیک حجت ہیں اور اگر ان میں باہمی اختلاف ہو تو اسے اللہ اور رسول کی طرف لوٹایا جائے گا۔ اور اگر ایک نے بات کی ہو اور دوسرے نے اس سے اختلاف نہ کیا ہو درآنحالیکہ وہ قول پھیلا نہ ہو تو اس میں نزاع ہے۔ جمہور علماء اس سے احتجاج کرتے ہیں۔ جیسے ابوحنیفہ، مالک اور امام احمد (مشہور قول کے مطابق) اور امام شافعیؒ (ایک قول کے مطابق) ان کی جدید کتابوں میں اس طرح کے قول سے متعدد مقامات میں احتجاج کیا گیا ہے لیکن کچھ لوگ کہتے ہیں کہ یہ ان کا قدیم قول ہے)۔

صاحب کشف الاسرار لکھتے ہیں:

"ویحکی عن الشافعی انہ کان یقول ان ظہر القول من اکثر العلماء والساکتون نفر یسیر یثبت الاجماع"۔ (جلد ۳ ص ۲۲۹)

(امام شافعی سے نقل کیا جاتا ہے کہ وہ کہتے ہیں کہ اکثر علماء سے اتفاق ثابت ہو اور سکوت اختیار کرنے والے تھوڑے سے افراد ہوں تو اس سے اس کا اجماع ہونا ثابت ہو جائے گا)۔

مولانا سید ابوالاعلیٰ مودودی رحمہ اللہ علیہ اس مسئلہ پر سیر حاصل بحث کرتے ہوئے آخر میں فیصلہ کن بات فرماتے ہیں:

"مذکورہ بالا بحث سے یہ بات واضح ہو جاتی ہے کہ اگر کسی مسئلے میں نصِ شرع کی کسی تعبیر پر یا کسی قیاس یا استنباط پر، یا کسی تدبیر و مصلحت پر اب بھی اہلِ حل و عقد کا اجماع یا ان کی اکثریت کا فیصلہ فی الواقع ہو جائے تو وہ حجت ہوگا اور قانون قرار پائے گا، اس طرح کا فیصلہ اگر تمام دنیائے اسلام کے اہلِ حل و عقد کریں تو وہ تمام دنیائے اسلام کے لیے قانون ہوگا اور کسی ایک اسلامی مملکت کے اہلِ حل و عقد کریں تو وہ کم از کم اس مملکت کے لیے قانون ہونا چاہیے"۔ (اسلامی ریاست پہلا ایڈیشن ص ۲۶۰)

بہر حال کسی مسئلہ کے بارے میں بحث ہو سکتی ہے کہ اس پر اجماع ہے یا نہیں اور اجماع ہے تو وہ کونسا اجماع ہے۔ اجماع منطوقی یا اجماع سکوتی۔ اور اس مسئلہ کا تعلق ضروریات اور متواترات دین سے ہے یا نظری یا علمی دائرے سے ہے اور اس کے اجماع کے انکار سے تکذیبِ رسول ہوتی

ہے یا نہیں - لیکن ثبوتِ اجماع کے بعد وہ حجت ہے - پھر جن دلائل اور وجوہ کی بنا پر اجماعِ صحابہ حجت بنتا ہے وہی ہر دور کی اُمت کے اجماع کی حجیت کا تقاضا کرتے ہیں اس لیے اس لحاظ سے اجماعِ صحابہ کے ساتھ تابعین، تبع تابعین اور بعد کے ادوار کا اجماع بھی حجت قرار پاتا ہے۔

علامہ قرطبی امام ابن تیمیہ کے حوالے سے لکھتے ہیں:

"وفیہ دلیل علی صحۃ الاجماع ووجوب الحکم بہ لانھم اذا کانوا عدولا شھدوا علی الناس - کل عصر شھید علی من بعدہ فقول الصحابۃ حجۃ وشاھد علی التابعین وقول التابعین علی من بعدھم واذا جعلت الامۃ شھداء فقد وجب قبول قولھم ولا معنی لقول من قال ارید بہ جمیع الامۃ لانہ حینئذ لا یثبت مجمع علیہ الی قیام الساعۃ" (تفسیر قرطبی جلد ۲ ص ۱۵۶)

(اس میں اجماع کی صحت، اس کے مطابق فیصلہ دینے پر دلیل ہے اس لیے کہ جب وہ لوگوں پر عادل اور گواہ ہیں تو ہر دور اپنے بعد والوں کے لیے گواہ ہوگا - صحابہ کا قول دلیل اور گواہ ہے تابعین پر اور تابعین کا قول بعد والوں پر اور جب اُمت گواہ ہے تو اس کا قول قبول کرنا واجب ہوگیا - جو شخص کہتا ہے کہ اس سے ساری اُمت مراد ہے اس کی بات کا کوئی اعتبار نہیں ہے اس لیے کہ ایسی صورت میں قیامِ قیامت تک کوئی بھی مسئلہ مجمع علیہ نہیں بن سکے گا۔) (ایضاً تفسیر مظہری، تفسیر آیت وکذالک جعلنکم امۃ وسطاً)

علامہ ابن عابدین شامی مختلف قسم کے اجماعوں پر بحث کرتے ہوئے فرماتے ہیں۔

"ومثلہ فی نور العین عن شرح العمدۃ اطلق بعضھم ان منکر الاجماع یکفر والحق ان المسائل الاجماعیۃ تارۃً یصحبھا التواتر عن صاحب الشرع کوجوب الخمس وقد لا یصحبھا فالاول یکفر جاحدہ لمخالفتہ التواتر لا لمخالفۃ الاجماع ثم نقل فی نور العین عن رسالۃ الفاضل الشھیر حسام جلبی من عظماء السلطان السلیم بن بایزید خان ما نصہ واذا لم تکن الآیۃ او الخبر المتواتر قطعی الدلالۃ او لم یکن

الخبر متواتراً وكان قطعياً لكن فيه شبهة او لم يكن الاجماع اجماع الجميع اركان ولم يكن اجماع جميع الصحابة اركان اجماع جميع الصحابة ولم يكن قطعياً بان لم يثبت بطريق التواتر اوكان قطعياً لكن كان اجماعاً سكوتياً ففي كل من هذه الصور لايكون الجحود كفراً۔ (باب المرتد ج ۴ ص ۲۲۳)

(شرح عمدہ سے نور العین میں اسی طرح لکھا ہے کہ بعض نے مطلقاً اجماع کے منکر کو کافر قرار دیا ہے لیکن حق بات یہ ہے کہ اجماعی مسائل کے ساتھ کبھی تواتر ہوتا ہے جیسے پانچ ارکان اور کبھی نہیں ہوتا۔ پہلی قسم کا منکر کافر ہے تواتر کے انکار کی وجہ سے نہ کہ اجماع کی مخالفت کی وجہ سے۔ اس کے بعد فاضل حلبی کے رسالہ سے نقل کیا گیا ہے کہ جب آیت اور خبر متواتر قطعی الدلالۃ نہ ہو یا خبر متواتر ہی نہ ہو یا قطعی ہو، لیکن اس میں شبہ ہو یا اجماع تمام کا اجماع نہ ہو یا تمام کا اجماع ہو لیکن تمام صحابہ کا اجماع نہ ہو یا تمام صحابہ کا اجماع ہو لیکن قطعی نہ ہو کہ بطریق تواتر ثابت نہ ہو یا قطعی ہو لیکن اجماع سکوتی ہو تو ان ساری صورتوں میں انکار کفر نہ ہوگا۔)

اجماع کے مسئلہ کی تہ تک پہنچنے اور اس کو ٹھیک ٹھیک طرح سے سمجھنے کے لیے پہلی ضروری چیز یہ ہے کہ اس موضوع سے متعلق سارے لٹریچر کا مطالعہ کرنا چاہیے۔ بعض مصنّفین کے کلام کے اصل مقصد کو نہ سمجھنے کی بنا پر کچھ لوگ اس کو سمجھنے میں غلطی کر جاتے ہیں اور اس انداز سے اس مسئلہ پر گفتگو کرتے ہیں گویا کہ اجماع کا سرے سے وجود ہی نہیں۔ کچھ اس قسم کا تاثر امام شافعی اور امام احمد کے متعلق دیا جاتا ہے حالانکہ ابن تیمیہ تو اس بات کی تصریح کر چکے ہیں کہ "اہل سنت والجماعت" کا فرقِ ضالہ سے امتیاز ہی سنت اور اجماع کو تسلیم کرنے کی بنا پر ہے۔

اس مسئلہ میں غلط فہمی کی وجہ یہ ہے کہ دورِ اختلاف میں ہر فرقے نے اپنے مسائل پر اجماع کا دعویٰ شروع کر دیا۔ اور ایسے لوگوں نے بھی اس کا سہارا لینا شروع کر دیا جنہیں اسلاف کے واقعات، حالات اور اقوال پر نظر نہیں تھی ان لوگوں کے حال کو پیش نظر رکھتے ہوئے امام احمد نے یہ کہہ دیا کہ " اس طرح کے مدعیانِ اجماع کذاب ہیں" نہ یہ کہ مطلقاً دعویٰ اجماع کو انہوں نے غلط کہا ہو۔ تفصیل کے لیے دیکھیے (اصول مذہب الامام احمد بن حنبل)

دوسری چیز اس نکتہ کو ذہن نشین کرنا ہے کہ فقہائے اسلام اور مجتہدین نے ہمیشہ اپنی علمی آراء پر کسی دباؤ کو قبول نہیں کیا۔ نہ ہی انہوں نے اس سلسلہ میں دلائل سے قطع نظر کسی اور رشتے کا لحاظ کرتے ہوئے کسی سے اتفاق یا اختلاف کیا ہے۔ اس طرح ان کا اتفاق و اختلاف خالص للّٰہیت کے ساتھ ہو کر ہم تک پہنچ گیا۔ اب تک جو اجماعی مسائل ہم تک پہنچے ہیں وہ ہر طرح کی مصنوعیت، مداہنت اور نفسانیت سے پاک ہیں۔ ان پر اجماع منعقد کرنے کے لیے کسی نے کسی پر دباؤ نہیں ڈالا۔ کوئی مجمع منعقد نہیں کیا بلکہ ہر ایک نے اپنی اپنی جگہ ان پر خالصتاً اپنی علمی رائے دی ہے۔ اور ایسا ہی شریعت میں مطلوب بھی ہے۔ مسئلہ کی حقیقت سے ناواقف لوگ اس طرح کی صورتِ حال کو نقص قرار دیتے ہوئے کہتے ہیں کہ چونکہ کسی حکومت کو اس بات سے دلچسپی نہ تھی کہ دُنیا بھر کے مجتہدین کو ایک جگہ جمع کر کے پیش آمدہ مسائل کے بارے میں رائے لیتی اس لیے مسائل پر اجماع کا سلسلہ نہ کار رہا" اور ہم نہیں کہہ سکتے کہ کن مسائل پر اجماع ہے اور کن پر نہیں۔ اس سلسلہ میں اصل صورت حال ہم نے آپ کے سامنے رکھ دی ہے۔ اس کی روشنی میں آپ اندازہ کر سکتے ہیں کہ ایسی کسی مصنوعیت کے نہ ہوتے ہوئے آزادانہ طور پر جو اجماع ہوا ہو گا وہ اپنے اندر کس قدر وزن رکھتا ہے۔ اس سلسلہ میں صرف اس حد تک اس بات کو درست قرار دیا جا سکتا ہے کہ چونکہ خلافتِ راشدہ کے بعد جماعتی نظام درہم برہم ہو گیا تھا، اس لیے اب بلا تحقیق یہ دعویٰ نہیں کیا جا سکتا کہ فلاں مسئلہ میں اجماع ہے۔ جبکہ خلافتِ راشدہ کے بارے میں آسانی سے معلوم کیا جا سکتا ہے کہ اس میں فلاں فلاں مسائل پر اجماع ہے — اردو دائرہ معارف اسلامیہ کے مصنّف لکھتے ہیں "چونکہ یہ اتفاق رائے کسی مجلسِ شوریٰ یا اجماع علماء میں نہیں ہوتا بلکہ غیر شعوری طور پر از خود ظہور میں آتا ہے اس لیے کسی مسئلہ میں اس کے وجود کا علم گذشتہ حالات و واقعات پر نظر ڈالنے سے ہی ہو سکتا ہے۔" (لفظ اجماع ص ۱۰۰۹)

تیسری چیز یہ ہے کہ اس وقت ہمارے سامنے ہماری علمی تاریخ کا پورا سرمایہ موجود ہے۔ کسی بھی ملک اور کسی بھی علاقے کے کسی مجتہد یا غیر مجتہد نے کسی مسئلہ کے بارے میں جو رائے دی ہے وہ محفوظ ہے حتیٰ کہ ہمارے علماء نے اپنے مخالف فرقوں اور ان کے ایسے علماء جن کی کوئی قدر و منزلت نہ تھی ان کے اقوال و آراء کو بھی اپنی کتابوں میں بلا کم و کاست بیان کر دیا ہے۔ اہل سنت والجماعت سے آپ کو شیعہ کی جملہ اقسام اور خوارج، معتزلہ اور جہمیہ وغیرہ کے عقائد و نظریات

سے لے کر فقہی آرا تک ملتی ہیں۔ آج کے اس دَور میں جب کہ ایک فرقہ دوسرے فرقے کا نام تک لینا گوارا نہیں کرتا یہ بات سمجھ میں نہیں آسکتی لیکن حقیقت یہ ہے کہ یہ ایک بڑا کارنامہ ہے جو ہمارے اسلاف نے انجام دیا ہے اس کی روشنی آج ہم آسانی سے مجمع علیہ مسائل کی ایک طویل فہرست تیار کر سکتے ہیں جو کئی مجلدات پر مشتمل ہو۔

آپ کو اُمت کے مختلف فرقوں میں وسیع تر اختلافات کے باوجود جو مشترک چیزیں ملتی ہیں، ان کی بنیاد اس کے سوا اور کیا ہے کہ وہ قدرِ مشترک مجمع علیہ ہے۔ آپ اس اصول کو پیشِ نظر رکھ کر بھی اجماعی مسائل کی ایک فہرست تیار کر سکتے ہیں۔

جہاں تک اس بات کا تعلق ہے کہ اب اس دَور میں اجماع کیسے منعقد ہوگا اور اس کی کیا صورت ہوگی تو اس سلسلہ میں عرض یہ ہے کہ اس دَور میں اوّلاً تو یہ ہونا چاہیے کہ پہلے سے مجمع علیہ مسائل کو سامنے لایا جائے۔ مثلاً ختم نبوت کا مسئلہ پہلے سے مجمع علیہ چلا آرہا ہے اس لیے اس پر کسی اسمبلی سے قرارداد پاس ہونا یہ معنی نہیں رکھتا کہ اس مسئلہ پر اجماع ہو رہا ہے بلکہ یہ معنی رکھتا ہے کہ پہلے سے مجمع علیہ مسئلہ پر عملدرآمد ہو رہا ہے۔

دوسرے مرحلے پر یہ کام ہوگا کہ نئے پیش آمدہ مسائل کے بارے میں دنیا بھر کے ماہرینِ شریعت اسی طرح سے آزادانہ اور علمی رائے دیں جس طرح اسلاف دیتے آئے ہیں۔ کسی ایک ملک کے ماہرینِ شریعت کی قرارداد سے مسئلہ مطلقاً اجماعی نہیں بنے گا۔ اور پھر آج کل اسمبلیاں تو اس سلسلہ میں کوئی حیثیت نہیں رکھتیں اس لیے کہ ان کے ممبران "اہلِ اجماع" نہیں ہیں۔ (اہل اجماع یا اہل حل وعقد علماء اور فقہاء ہیں)۔

اس کی بجائے رابطہ عالم اسلامی جیسے آزاد علمی ادارے اس سلسلہ میں مؤثر کردار ادا کر سکتے ہیں۔

مسلمانوں کا ذوقِ کتاب داری

برِّ صغیر میں اور لاہور میں

جناب پروفیسر محمد سلیم صاحب

پنجاب پبلک لائبریری لاہور کا صد سالہ یادگاری جلسہ ۲۹ جنوری ۱۹۸۵ء کو جسٹس ڈاکٹر جاوید اقبال کی صدارت میں قائداعظم لائبریری باغ جناح لاہور کے سماعت خانہ میں منعقد ہوا تھا۔ اس میں یہ مقالہ پڑھا گیا تھا۔

طبعی لحاظ سے بھی عرب ایک ریگستان تھا اور علوم و فنون کی گرم بازاری کے لحاظ سے بھی بنجر تھا۔ جب اسلام آیا تو اس ریگستان میں علوم و فنون کی فصلِ بہار لہلہا اٹھی۔ ہر گوشہ میں درس و تدریس کی بساط بچھی ہوئی تھی۔ ہر مسجد قال اللہ اور قال الرسول کے زمزمۂ جاں نواز کے نغموں سے گونج رہی تھی۔ علوم و فنون کی ایجاد اور اختراع میں مسلمانوں نے کسی دوسری قوم کا بارِ احسان نہیں اُٹھایا۔ کسی کے سامنے اُنہوں نے زانوئے تلمذ طے نہیں کیا۔ تمام علوم و فنون اُن کے اپنے طبع زاد ہیں۔ ان کے اپنے ذہن کی اختراع ہیں۔

ناخواندہ عرب کے ناخواندہ نبیؐ پر پہلی وحی جو نازل ہوئی وہ پڑھنے سے متعلق ہے:
اقرأ باسم ربك الذی خلق۔ اور دوسری وحی جو نازل ہوئی وہ لکھنے سے متعلق ہے:
نٓ والقلم وما یسطرون۔ اس لیے مسلمانوں میں پڑھنے اور لکھنے کی تحریک قرآن مجید سے جاری ہوئی۔ اس کے بعد نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے کوہِ صفا پر دارِ ارقم بن ابی ارقم میں ایک مخفی مدرسہ

جاری فرما دیا۔ جہاں نئے نئے اسلام لانے والوں کو آپؐ تعلیم دیتے تھے۔ ہجرت کے بعد جب مدینہ منورہ میں آزاد فضا میسر آئی تو مسجد نبوی کی تعمیر کے ساتھ آپؐ نے صفہ کا مدرسہ بھی شروع کیا۔ یہ اسلام کا پہلا باقاعدہ مدرسہ تھا۔ جہاں سے مسجد اور مدرسہ کا دائمی رشتہ قائم ہو گیا۔ اس کے بعد جہاں جہاں مسلمانوں کے قدم پہنچے، جہاں جہاں انہوں نے مسجدیں تعمیر کیں وہاں مدارس بھی قائم ہو گئے۔

کتب نویسی کو مزید تقویت حضرت عمر بن عبد العزیز (۱۰۱ - ۹۹ھ) کے فرمان سے حاصل ہوئی۔ آپ نے پوری مملکت میں اہل علم کو ترغیب دی کہ وہ احادیث رسول صلی اللہ علیہ وسلم کو جمع کریں۔ پہلے مسلمانوں نے احادیث کے مجموعے تیار کیے۔ پھر ان کی تنقیح اور ترتیب میں مشغول ہو گئے۔ صدیوں سخت محنت اور جاں فشانی سے مسلمان علماء نے حدیث کی چھان پھٹک کا کام مکمل کیا۔ سقوط بغداد (۶۵۸ھ) تک سب سے اعلیٰ اور سب سے اشرف علم، علم حدیث تھا۔

کتب نویسی کی تحریک کو کاغذ سازی کی صنعت سے غیر معمولی تقویت پہنچی۔ کاشغر کے چینی قیدیوں سے (۱۰۵ھ) مسلمانوں نے یہ صنعت حاصل کی اور پھر ساری دنیا میں اس کو عام کر دیا۔ اس کے بعد کتب خانوں کا وجود میں آجانا لازمی امر تھا۔ مولانا شبلی نے لکھا ہے کہ معاویہ بن یزید (۶۴ھ) نے اسلام میں پہلا کتب خانہ قائم کیا تھا۔ معمر نے بیان کیا ہے کہ امام زہری کی کتب اونٹوں پر لاد کر خلیفہ ولید ثانی کے کتب خانہ میں لائی گئی تھیں۔ اس کے بعد کتب نویسی اور کتب سازی کو فروغ حاصل ہوا۔

دمشق، بغداد اور قاہرہ عالم اسلام میں علوم و فنون کے مراکز تھے۔ مساجد میں درس و تدریس کی گرم بازاری تھی۔ شوقین طلباء دور دراز علاقوں سے سفر کر کے ان شہروں میں پہنچتے تھے اور فاضل اساتذہ سے علم حاصل کرتے تھے۔ علمی سرگرمیاں بھی شباب پر تھیں۔ علماء تصنیف و تالیف میں مشغول تھے۔ کاتب اور وراق کتابوں کی نقل نویسی میں منہمک رہتے تھے۔ بیت الحکمت اور خزانۃ الکتب کے نام سے اعلیٰ پیمانہ پر کتب خانے قائم ہو رہے تھے۔

کُتاب تحسین خط میں مشغول تھے۔ عہد عباسی کا مشہور خطاط ابن مقلہ (۳۲۷ھ) نے ایک شاہی فرمان لکھ کر قیصر روم کو بھیجا تھا۔ قیصر خط کی رعنائی اور خوب صورتی سے بے حد متاثر ہوا اور اس نے اس کو خزانہ میں محفوظ کر لیا (علم الکتاب از ابوحیان توحیدی ۴۱۲ھ۔ اردو ترجمہ ص ۱۵۔ طبع لاہور ۱۹۶۶ء) تزئین اور آرائش کتب کا فن اپنے عروج پر تھا۔ اوراق کتب پر نقش و نگار بنانے میں آب زر

استعمال کیا جاتا تھا۔ بغداد میں تاتاریوں نے اور صلیبیوں نے غرناطہ، اندلس میں مسلمانوں کے کتب خانے نذرِ آتش کیے۔ اس وقت کتابیں جل رہی تھیں اور سونا پگھل پگھل کر زمین پر بہہ رہا تھا۔ (البدایہ والنہایہ حافظ ابن کثیر)

علوم وفنون کی یہ ساری سرگرمیاں اور تزئینِ کتب کی یہ اعلیٰ روائتیں سارے عالم اسلام میں تقریباً یکساں فروغ پا رہی تھیں۔ ایک ملک کے لوگ دوسرے ملک کے لوگوں سے مسابقت کرتے تھے۔ ابنِ حزم اندلسی نے ایک مستقل کتاب لکھی ہے۔ فضل المغاربہ علی المشارقہ۔ یعنی اہل مغرب ــــــ اندلس اور مراکش وغیرہ کی علمی فضیلت مشارقہ پر یعنی شام، ایران، خراسان پر۔

برِصغیر ہند و پاکستان کا خطہ دولتِ غزنویہ کے زمانے میں عالم اسلام کا حصہ بنا ہے۔ ایران اور خراسان سے آمدہ علماء اور فضلاء نے علمی سرگرمیاں اور تصنیفی روایات برِصغیر ہند و پاکستان میں منتقل کر دیں۔ پھر یہاں بھی بہار آ گئی۔ مساجد، مدارس اور خانقاہوں میں وہی علمی سرگرمیاں جاری ہو گئیں اہلِ علم اور اہلِ ہنر کی قدر دانی ہونے لگی۔ جلدی ہی اس خطہ نے ترقی کر لی اور علم کی سرپرستی اور فروغ میں یہ خراسان اور ماوراء النہر کا ہم پلہ ہو گیا۔ البتہ یہاں کوئی ابنِ حزم پیدا نہیں ہوا۔ جو اس خطہ کے علماء اور فضلاء کے محاسن اور کارنامے بیان کرتا ــــــ بلاشبہ یہ خطہ عالم اسلام میں دیر سے شامل ہوا ہے، مگر یہ کوئی فروتر حصہ نہیں تھا۔

دولتِ غزنویہ کا بانی سلطان محمود غزنوی خود بھی صاحبِ علم تھا۔ وہ فقہ کی ایک کتاب کا مصنف ہے۔ وہ علم کا شیدائی تھا۔ اس کے دربار سے چار سو علماء، فضلاء اور شعراء وابستہ تھے۔ اس نے غزنی میں ایک عالی شان کتب خانہ اور ایک عجائب خانہ قائم کیا تھا۔ (فرشتہ) پٹھان اور بلوچ قبائل میں اسلام کی اشاعت کے لیے اس نے مدارس قائم کیے تھے۔ انگریز مورخین نے اپنی سیاسی چالوں کے پیشِ نظر اس اولین فاتح کو بدنام کیا ہے۔ ورنہ وہ ہندوؤں پر بھی مہربان تھا۔ پھر مفتوحہ شہر لاہور کا گورنر اس نے اپنے ہندو خادم تلک کو مقرر کر دیا تھا۔ سومنات کی فتح کے موقعہ پر بھی اس کے ساتھ ہندو فوج تھی۔ قنوج کی فتح کے موقعہ پر راجہ آدیہ نے محمود کی شان میں ایک قصیدہ پڑھا تھا جو محمود چیتر کے نام سے مشہور ہے۔ محمود نے خوش ہو کر اس کو ایک ہاتھی انعام میں دیا تھا (معارف اعظم گڑھ) محمود کا نام اسلامی دنیا کے دوسرے علم دوست اور معارف پرور امراء مثلاً صاحب ابنِ عباد

اور خانخانان کے سامنے لیا جا سکتا ہے۔

عربی رسم الخط کی ایک عجیب و غریب خصوصیت یہ رہی ہے کہ جب بھی کوئی نئی اسلامی سلطنت قائم ہوئی اور نیا دارالحکومت بنا تو وہاں نیا خط — طرزِ نگارش — وجود میں آگیا۔ کوفہ دارالحکومت بنا تو خطِ کوفی وجود میں آیا۔ بغداد دارالحکومت بنا تو وہاں خط نسخ ایجاد ہوا۔ ایل خانیوں نے تبریز کو دارالحکومت قرار دیا تو وہاں خطِ تعلیق ایجاد ہوا۔ عثمانیوں نے قسطنطنیہ کو خلافت کا مستقر قرار دیا تو وہاں خطِ دیوان وجود میں آیا۔ تیموریوں نے ہرات کو اپنا دارالحکومت بنایا تو وہاں خطِ نستعلیق وجود میں آیا۔ انہی روایت کے تتبع میں جب اسلامی حکومت کو دہلی میں استحکام حاصل ہوا تو وہاں خطِ بہار وجود میں آیا۔ خطِ بہار ہندوستان میں ایجاد ہوا۔ اور یہاں ہی اس نے فروغ پایا۔

نظام الملک طوسی کے بعد عالمِ اسلام میں مدارس قائم کرنے کا سلسلہ جاری ہو گیا تھا۔ نظامیہ بغداد، نیشاپور وغیرہ سے بڑے بڑے مدارس بھی قائم ہوئے جیسے مدرسہ مستنصریہ بغداد جس کی عمارت آج تک موجود ہے۔ لیکن عالمِ اسلام کا سب سے بڑا مدرسہ ربع رشیدی (ربع CAMPUS) تھا جو تبریز کے قریب قائم ہوا تھا۔ اسی کو ایل خانیوں کے وزیر اعظم رشید الدین فضل اللہ نے قائم کیا تھا۔ یہ مدرسہ کیا تھا اہلِ علم کی ایک بستی تھی جو کئی سو ایکڑ رقبہ پر محیط تھی۔ جہاں سیکڑوں سقے، لکڑہارے، نان پز، باورچی، خدمت گار دن رات مشغولِ کار رہتے تھے۔ طلبا اور اساتذہ کی یہ اعلیٰ قسم کی بستی تھی۔

ایسا ہی ایک مدرسہ فیروز شاہ تغلق (۷۹۰ھ) نے دہلی میں قائم کیا تھا۔ یہ ۷۰ ایکڑ پر محیط تھا۔ مدرسہ کی عمارت دو منزلہ تھی۔ گنبد کے اطراف میں رنگ برنگے شیشے لگے ہوتے تھے۔ غروبِ آفتاب کے وقت عجب خوشنما منظر بن جاتا تھا۔ مدرسہ میں شیرازی قالین بچھے رہتے تھے۔ خوراک میں تیتر بٹیر مچھلی کا گوشت دیا جاتا تھا۔ اساتذہ کو پان کے بیڑے چاندی کے ورق میں لپیٹے ہوئے دیئے جاتے تھے۔ گرمیوں میں ذائقہ دار شربتوں سے ان کی تواضع کی جاتی تھی۔ اساتذہ شامی جبے پہنتے تھے اور مصری دستار باندھتے تھے۔ مطہر دہلوی نے اس کی مدح میں قصیدے لکھے ہیں۔

ان مدارس میں اساتذہ ہر چیز سے بے نیاز ہو کر مستقل مزاجی سے درس و تدریس میں مشغول رہتے تھے۔ ان کے شوق اور مستقل مزاجی کا اندازہ اس واقعہ سے لگایا جا سکتا ہے کہ

ہلاکو خاں کے ہاتھوں اہلِ بغداد کے سر سے ایک قیامت گزر گئی - چالیس دن تک قتل و غارت گری اور آتش زنی ہوتی رہی - جب تباہی اور بربادی ختم ہوئی تو ہلاکو خاں اُجڑے اور تباہ حال شہر کے نظارے کے لیے نکلا - اُس کی حیرت کی انتہا نہ رہی جب اُس نے دیکھا کہ مدرسہ مستنصریہ میں حسبِ سابق استاد اور طلبہ موجود ہیں اور درس و تدریس میں مشغول ہیں - گویا اس شہر میں کچھ ہوا ہی نہیں - (الفخری - صباطبائی)

اِس سے ملتا جلتا واقعہ دہلی میں بھی پیش آیا - ۱۸۵۷ء کے ہنگامہ میں انگریزی فوجیں دہلی پر گولہ باری کر رہی تھیں - میاں جی نذیر حسین کی مسجد میں گولے آ کر گر رہے تھے - محمد اشرف سندھو لکھتے ہیں - اس حالت میں بھی حدیث کا درس برابر جاری تھا - میاں جی استقلال کا پہاڑ بنے ہوئے بیٹھے تھے - بمصداق آیت کریمہ: الا ان اولیاء اللّٰہ لاخوف علیھم ولا ھم یحزنون -

درس و تدریس کے ساتھ ساتھ یہ علما تصنیف و تالیف میں بھی وقت صرف کرتے تھے - بعض علما تو مسلسل لکھتے رہتے تھے - ابوریحان البیرونی (۱۰۵۱ء) کے متعلق یاقوت حموی نے معجم البلدان میں لکھا ہے - " بیرونی ہمیشہ علم کے حاصل کرنے میں مشغول رہتا تھا - قلم کو ہاتھ سے اور آنکھ کو کتاب سے کبھی جدا نہیں کرتا تھا - سال میں صرف دو دن ایسے تھے کہ وہ فارغ رہتا تھا - وہ نوروز اور مہرجان کے تہوار تھے - ان دنوں میں وہ دوست احباب کے لیے کھانا تیار کرتا تھا - اس سے ملنے کے لیے آتے تھے - اس لیے کہ وہ مجرد تھا - اُس نے شادی نہیں کی تھی -

ہمارے یہاں بھی ایک ایسے ہی کثیر التصانیف بزرگ مولانا وحید الزمان حیدرآبادی تھے (۱۸۷۰ء) - وحید اللغات میں وہ ایک جگہ لکھتے ہیں " میری عمر اب ۷۰ سال کے قریب ہے، لیکن اللہ کے فضل و کرم سے آنکھ اور ہاتھ کی قوت مثلِ ایام جوانی ہے ----- ابھی تک کئی میل پیدل لیتا ہوں اور سب سے زیادہ عجیب بات یہ ہے کہ صبح چھ بجے سے شام پانچ بجے تک برابر لکھتا رہتا ہوں اور وہ بھی روزانہ - یہاں تک کہ یوم العید کو ناغہ نہیں کرتا - بڑے بڑے قوی اور مضبوط جوان چھ گھنٹے کام کرنے کے بعد بھاگ کھڑے ہوتے ہیں - میں گیارہ گھنٹے برابر لکھتا رہتا ہوں - ذٰلک فضل اللّٰہ یؤتیہ من یشاء - باوجود اس کے کہ غذا میری دو پیسہ بھر چاول اور ایک پیسہ بھر آٹا ہے اور سادہ شوربا اور کسی قدر دودھ ہے - دودھ آدھ پاؤ سے زیادہ نہیں (شاہی ڈبل پیسہ مراد ہے)

ایک ایسے ہی کثیر التصانیف بزرگ نواب صدیق حسن خاں، نواب بھوپال تھے۔ ان کے شوقِ تصنیف کا اندازہ اس واقعہ سے ہوتا ہے کہ وہ جب شادی بیاہ میں شرکت کے لیے جاتے تھے تو اپنا بستہ کتب اور قلمدان ضرور ساتھ لے جاتے تھے۔ کھانے میں عموماً دیر ہو جاتی ہے وہ ایسی حالت میں ایک گوشہ میں بیٹھ کر لکھنا شروع کر دیتے تھے۔

اس دور میں کتابوں کی قدر و منزلت بھی بہت زیادہ ہوتی تھی۔ امرا اور حکمران کتابوں پر بے دریغ روپیہ خرچ کرتے تھے۔ خاص طور پر مصنف کا اوّلین نسخہ حاصل کرنے کے لیے۔ ابوالفرج اصفہانی اموی (۳۵۶ھ) نے ادب کی مشہورِ زمانہ کتاب الاغانی تصنیف کی۔ اندلس کے خلیفہ الحکم ثانی (۳۶۶ھ) کو اس کا علم ہو گیا۔ اس نے اس کے لیے ایک ہزار دینار (از سرخ) صرف کر کے پہلا نسخہ حاصل کیا۔

ہمارے یہاں محمد شاہ تغلق (۷۵۲ھ) بڑا عالم فاضل بادشاہ گزرا ہے۔ اس کو معلوم ہوا کہ مشہور عالمِ دین قاضی عضد الدین ایجی کتاب مواقف لکھ رہے ہیں۔ بادشاہ نے مولانا معین الدین عمرانی دہلوی کو ایران ان کی خدمت میں بھیجا کہ وہ ہندوستان تشریف لے آئیں اور مذکورہ کتاب بادشاہِ دہلی کے نام منسوب کریں۔ تحفہ تحائف اور انعام اکرام لے کر ہندی سفارت روانہ ہوئی۔ جب شیراز کے بادشاہ ابواسحاق (۷۴۴ھ) کو ہندی سفارت کا علم ہوا وہ قاضی عضد الدین کے جانے میں مانع ہوا۔ اس نے قاضی سے کہا میں آپ کی ہر طرح خدمت کرنے کو تیار ہوں یہ میرا تخت حاضر ہے، میری منکوحہ کے علاوہ جو شے آپ چاہیں لے سکتے ہیں، لیکن شیراز چھوڑ کر نہ جائیں۔ اس کے بعد قاضی نے سفر کا ارادہ ترک کر دیا۔

اہلِ علم اور اہلِ فن کی قدر دانی کا ایک حیرت انگیز واقعہ ایران کے شاہ اسمٰعیل صفوی سے متعلق ہے۔ ترکوں اور ایرانیوں کے درمیان ایک فیصلہ کن جنگ ۹۲۰ھ میں ہوئی ہے جو جنگ چالدران کے نام سے مشہور ہے۔ جنگ میں جب شکست کے آثار نظر آنے لگے تو شاہ اسمٰعیل صفوی نے نادرۂ روزگار خطاط محمود اور نادرۂ روزگار مصور بہزاد کو پہاڑوں میں کہیں چھپا دیا تاکہ شکست کی صورت میں عثمانی فوجیں ان دو نایاب فن کاروں کو قسطنطنیہ نہ لے جائیں۔ دارالسلطنت اصفہان کے مال و متاع سب کے مقابلہ میں اس نے صرف فن کاروں کی حفاظت کی۔ اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ اس کے نزدیک ان افراد کی کیا قدر و قیمت تھی۔

اس سے ملتا جلتا واقعہ ہمارے یہاں بھی پیش آیا ہے۔ کھمبائت کی جنگ سے واپسی کے موقع پر ایک گروہ نے ہمایوں بادشاہ کے خیمہ پر شبخون مارا۔ اور سارا مال و متاع لوٹ کر لے گئے۔ اس میں تاریخ تیموری کا وہ نایاب نسخہ بھی تھا۔ جس کو بہزاد نے مصور کیا تھا۔ اس کے لیے ہمایوں نے وہیں ڈیرے ڈال دیئے۔ سارے لشکر کو پھیلا دیا کہ وہ نسخہ تلاش کر کے لائیں۔ جب تک وہ نسخہ دوبارہ حاصل نہ کر لیا، وہاں سے کوچ کا حکم نہ دیا۔ (اکبر نامہ۔ جلد اوّل۔ ص ۱۳۶)۔

برصغیر کے شہروں میں لاہور کو خاص اہمیت حاصل رہی ہے۔ ۴۱۳ھ میں سلطان محمود غزنوی نے اس شہر کو فتح کیا تھا، بعد میں اپنی ہندوستانی سلطنت کا اس کو مرکز بنایا۔ لاہور نے بڑی جلدی ترقی کی۔ حتیٰ کہ اس کو غزنی خورد کہنے لگے۔ یہاں سلطان ابراہیم بن مسعود (۴۵۰ — ۴۵۲) جب حکمران ہوا جو سال میں دو قرآن اپنے ہاتھ سے لکھتا تھا اور حرمین شریفین بھیج دیتا تھا۔ یہاں باہر سے علماء اور مشائخ آنے شروع ہو گئے۔ مثلاً سید اسمٰعیل محدث (۴۴۸ھ) سید حسین زنجانی (۴۳۱ھ) ابوالحسن علی ہجویری (۴۶۵ھ) علم و فضل کے ساتھ شعر و ادب کو بھی فروغ حاصل ہوا۔ ابوالفرج ملتی (۴۹۲ھ)۔ مسعود سعد سلمان (۵۱۰ھ) اس دور کے شعراء ہیں۔

ہندو دور میں کتابیں تاڑ کے پتوں پر یا بھوج پتر پر لکھتے تھے۔ پتوں کے درمیان میں سے ایک دھاگہ گزار کر ان پتوں کو نتھی کر لیتے تھے۔ جب مسلمان یہاں آئے تو اپنے ساتھ عالمِ اسلام کی علمی روایات اور کتاب سازی کے طریقے بھی لائے۔ مسلمان یہاں کاغذ لائے۔ انہوں نے سمرقندی، کشمیری، بہزن کوٹی (سندھی)، قطنی (روئی کا)، مختلف اقسام کے کاغذ بنائے۔ مسلمانوں نے یہاں آ کر جلد سازی کا فن سکھایا۔ آرائشِ کتب اور جلد سازی نے اس وقت ایک مستقل فن کی شکل اختیار کر لی تھی۔ ایک اعلیٰ درجہ کی کتاب کی تیاری میں مختلف فن کار حصہ لیتے تھے۔ مثلاً کاتب، مذہب، جدول کش، مجلد، صحاف، زرکوب، لاجوردشو اور کاغذ فروش۔ اس دور کی لاہور میں تیار کی ہوئی بعض کتابیں دنیا کے کتب خانوں میں آج بھی پائی جاتی ہیں۔ ایک کتاب پنجاب یونیورسٹی لائبریری میں موجود ہے۔ بھجۃ النفوس والاسرار فی تاریخ معجزۃ المختار اس کا نام ہے۔ اس کا مصنف عبداللہ بن عبدالملک ہے۔ اس کا کاتب ابو حامد بن ایوب بخاری ہے۔ تاریخ کتابت ۲۸ جمادی الاخری ۴۳۶ھ ہے۔ یہ سلطان مودود بن مسعود غزنوی کا زمانہ ہے۔

لاہور کی پُررونق صنعت زیادہ عرصہ تک قائم نہ رہ سکی۔ ۶۳۹ھ/۱۲۴۱ء میں ایک تاتاری حملہ آور دستے نشوالک کی پہاڑیوں کے راستے داخل ہو کر لاہور پر حملہ کر دیا۔ اور اس کو بُری طرح تباہ و برباد کر دیا۔ آئندہ ایک صدی تک پھر لاہور کا نام سننے میں نہیں آیا۔ مغل حکمرانوں کے دور میں لاہور کو پھر عروج حاصل ہوا۔ مغل سلطنت میں آگرہ کے بعد یہ دوسرے درجے کا شہر تھا۔ دوبارہ یہ شہر علماء و فضلاء کا ملجا و ماویٰ بن گیا۔ مغل حکمران خود بھی اہلِ علم ہوتے تھے۔ لاہور کا پہلا مغل گورنر مرزا قلیچ خان تھا وہ مرزا دانیال کا خسر اور اکبر بادشاہ کا سمدھی تھا۔ اس کا یہ معمول تھا کہ کچہری جانے سے قبل اڑھائی گھنٹے تک وہ طلبہ کو گھر پر تعلیم دیتا تھا۔ اس کے پاس ایک بڑا کتب خانہ تھا۔

مغل بادشاہوں کو فنِ خطاطی اور فنِ کتاب سازی سے عشق تھا۔ ہر فن کار کی قدر افزائی ہوتی تھی۔ مغل حکمران صفویوں سے عثمانیوں سے اور ازبکوں سے فن کی قدردانی میں مسابقت کرتے تھے۔ لاہور میں مسجد وزیر خاں کے پاس کاتب صحاف، اور وراق بیٹھے رہتے تھے۔ یہ لوگ نہایت سرعت سے لوگوں کو حسبِ منشا کتابیں نقل کر دیتے تھے۔ اس حیثیت سے یہ بغداد کے سوق الوراقین سے مشابہت رکھتا تھا۔ بانیٔ مسجد وزیر خاں نے اوّل روز سے اس کو اہلِ علم و فضل کا مرکز بنانے کی کوشش کی تھی۔ وصیت نامہ میں انہوں نے لکھا تھا:

"اس مسجد کا امام اور خطیب ایک ہی ہو جو بڑا خوش قراءت اور نماز کے احکام کا بڑا عالم ہو۔ نیز یہ شرط ہے کہ مشرقی دروازہ کے باہر بیس دکانیں مع بالاخانوں کے اسلامی کتب کے صحافوں (جلد ساز، کتب فروش، جملہ کتب بیچنے والے) کے بیٹھنے کے لیے ہوں گی اور وہ ہمیشہ بے کرایہ بیٹھیں گے۔ نیز شرط یہ ہے کہ مسجد میں دینی علوم کی تعلیم کے لیے دو مدرس ہوں گے اور ان کو مذکورہ اوقاف میں سے حق الخدمت دیا جائے گا۔ امام اور خطیب کو ایک روپیہ سے دس روپیہ روزانہ تک، مؤذن کو چار آنہ یومیہ۔ ہر ایک مدرس کو ایک روپیہ۔ مرقومہ رمضان المبارک ۱۰۵۱ھ (وقف نامہ مسجد وزیر خان۔ درج کتاب قانونِ وراثت از مولانا غلام دستگیر نامی ص ۲۴۰)۔

اس وصیت نامہ کی وجہ سے اس مسجد میں علماء، فضلاء، شعراء اور ادباء کا مجمع لگا رہتا تھا۔ خاص طور پر جمعہ کے روز یہاں مباحثے، مذاکرے، مناظرے اور مشاعرے منعقد ہوتے رہتے تھے۔

اس لحاظ سے یہاں جامع منصور بغداد اور جامع عمرو بن العاص قاہرہ کی روایات زندہ ہو گئیں سکھوں کے عہد تک یہ علمی سرگرمی اس مسجد میں بدستور جاری رہی۔

پاکستان میں انگریزی عہد کی قدیم لائبریری سکھر میں ہے۔ جہاز ران کمپنی (INDUS FLOATLA کے مینجر ہنری پوٹنجر (HENRY POTTENGER) نے ۱۸۳۹ء میں اس لائبریری کو قائم کیا تھا۔ ۱۸۶۹ء میں اس کو پبلک لائبریری بنا دیا گیا۔ اور عام لوگوں کے لیے کھول دیا گیا۔ آج بھی اس کو سکھر پبلک لائبریری کہتے ہیں۔

اس کے بعد پنجاب یونیورسٹی لائبریری قدیم ہے۔ یہ پاکستان کی عظیم لائبریری ہے۔ اس کا شرقی زبانوں کا حصہ نہایت قابلِ قدر ہے۔ حافظ محمود شیرانی اور پروفیسر شفیع کی کوششوں سے یہاں نادر کُتب کا ذخیرہ جمع ہو گیا ہے۔ سندھ کی علمی تاریخ کے لیے علی شیر تابغ کی کتاب تحفۃ الکرام ایک ناگزیر کتاب ہے۔ اس کا اصل نسخہ مصنّف کا قلمی یہاں موجود ہے۔ علی شیر نوائی ہراتی کا مقام ترکی شاعری میں ایسا ہے جیسا کہ اُردو میں غالبؔ کا ہے۔ مگر ترکی دُنیا میں اس کا دیوان مفقود ہے۔ وہ یہاں اس لائبریری میں رکھا ہوا ہے۔

اس کے بعد پنجاب پبلک لائبریری ہے۔ ۱۸۸۴ء میں اس کا آغاز ہوا ہے۔ اس کو علم دوست افراد اور افسروں کی سرپرستی حاصل رہی ہے۔ اس وجہ سے اس نے غیر معمولی انداز میں ترقی کی ہے۔ یہاں بھی کثیر کتب جمع ہیں۔ اس لائبریری کا شمار برصغیر کی چیدہ لائبریریوں میں ہوتا ہے۔ سرکاری مطبوعات سب یہاں موجود ہیں۔ یہ لائبریری اس علمی شہر کے شایانِ شان ہے۔

احتیاط

ترجمان القرآن میں ضرورتِ استدلال کے لیے آیات و احادیث شائع ہوتی رہتی ہیں۔ قارئین سے گذارش ہے کہ جن اوراق پر آیات و احادیث ہوں۔ ان کا خاص احترام ملحوظ رکھیں تاکہ بے ادبی نہ ہونے پائے۔ (ادارہ)

عہدِ بنو امیّہ میں علمی کارنامے

جناب عبد الرشید عراقی صاحب

خلافتِ راشدہ کے بعد خاندانِ بنو اُمیہ کی حکومت قائم ہوئی۔ اور اس حکومت کا آغاز حضرت امیر معاویہ رضی اللہ عنہ کی شخصی سلطنت ۴۱ھ میں ہوا۔ اور جس کا اختتام مروان ثانی (م ۱۳۲ھ) پر ہوا۔ اس دور کی مدّت حکمرانی ۹۱ سال ہے۔ یہ ۹۱ سالہ دور گونا گوں اور متضاد واقعات کا حامل ہے۔ اس دور میں آپ کو ظالم وجابر اور قتل وغارت گری پر کمربستہ امراء المسلمین بھی نظر آئیں گے۔ اور ایسے امراء المسلمین بھی نظر آئیں گے۔ جن کے تقدس، زہد وتقویٰ اور پرہیزگاری تاریخِ اسلام میں مسلّم ہے۔ جن کے زہد واتقاء، علمی تبحر اور فضل وعلم کی تعریف میں قلم کی زبان خشک ہوجاتی ہے۔ جن کے عدل وانصاف کے سامنے شاہ وگدا کی تمیز حرف غلط کی طرح باطل ہے۔ آپ کو اس ۹۱ سالہ دور میں ایسے حکمران بھی نظر آئیں گے جن کی زندگی جہاد فی سبیل اللہ میں صرف ہوئی۔ اور ایسے حکمران بھی نظر آئیں گے جنہوں نے مدینۃ الرسول کی بے حرمتی کی۔ اور آپ کو ایسے حکمران بھی ملیں گے جنہوں نے اسلام کی سربلندی کے لیے اپنی جان کے نذرانے پیش کیے۔ اور ایسے حکمران بھی ملیں گے جنہوں نے کعبۃ اللہ پر منجنیق سے سنگ باری کی۔ اعلائے کلمۃ الحق کے لیے سر کٹانے والے بھی ملیں گے۔ اور تختِ حکومت پر قبضہ کرنے کے لیے خونِ مُسلم کو پانی کی طرح سے بہانے والوں سے بھی ملاقات ہوگی۔

دینی علوم کی بنیاد عہدِ رسالت میں پڑ چکی تھی۔ اور عہدِ خلافتِ راشدہ میں تصنیف وتالیف کا کام شروع ہو چکا تھا۔ لیکن ان کا دائرۂ نگارش صرف مذہب تک محدود تھا۔ اور خلافتِ راشدہ

کے عہد میں قرآن مجید کی تدوین کا مقدس کارنامہ سرانجام پایا۔ اور تدوینِ حدیث کے سلسلے میں چند صحابہ کرامؓ نے ارشاداتِ رسالت مآب صلی اللہ علیہ وسلم کو ضبط تحریر میں لانے کی مہم انجام دی۔ تاریخ میں ایسے مجموعہ ہائے حدیث کے نام ملتے ہیں جو عہدِ صحابہ کرام میں ضبط تحریر میں آئے۔

خلافتِ راشدہ کے بعد بنی اُمیّہ کا دَور شروع ہوتا ہے۔ اور اموی دَور میں تابعین اور تبع تابعین کے مقدس وجود کی نشاندہی ہوتی ہے۔ ایمانی قوت، دینی حمیت، مذہبی و اخلاقی رُوح اور علمی و عملی خدمتوں کے اعتبار سے اسلام کے خیر القرون کے تین دَور ہیں:

صحابہ کرامؓ، تابعین اور تبع تابعین

اِن ہی تینوں اَدوار میں مسلمان دینی اور دُنیوی سعادت و فلاح کی معراج کمال کو پہنچے۔ صحابہ کرام کے بعد تابعین عظام ہی دین کا سرچشمہ تھے۔ یہ مقدس گروہ علم و عمل میں صحابہ کرام کا عکس تھا۔ اسی گروہ نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی تعلیمات اور صحابہ کرام کی علمی اور اخلاقی وراثت کو مسلمانوں میں پھیلایا۔ شخصی حکومت کے قیام سے اسلامی نظام میں جو خرابیاں پیدا ہوئیں۔ ان کی اصلاح کی۔ مذہبی علوم کی حفاظت و اشاعت کے لیے نئے علوم کی بنیاد رکھی۔ اسلام کی اشاعت کی۔ اور اس کی ترقی و ترویج میں کارہائے نمایاں سرانجام دیئے۔

تابعین کے بعد تبع تابعین کا دَور آتا ہے۔ اس مبارک عہد میں بھی اسلام کی ترقی و ترویج کے لیے بہت کام ہوا۔ اور حضرات تبع تابعین جو تابعین کرام کے جانشین تھے، انہوں نے بھی اپنی جانشینی کا پورا حق ادا کیا۔ اور تبع تابعین کے دَور کے نام بڑے بڑے ائمہ کرام جن کے فیض سے آج مذہبی علوم زندہ ہیں، سب تابعین کے حلقہ درس کے فیض یافتہ تھے۔

تابعین اور تبع تابعین کا مشترک اور اہم کارنامہ دینی علوم کی، جس پر مذہب اسلام کا دارومدار ہے۔ حفاظت و اشاعت اور قرآن و حدیث سے متفرع علوم کی تاسیس ہے۔ اگر ان بزرگوں نے جانکاہ تکلیفیں اُٹھا کر اس خزانہ کو محفوظ نہ کیا ہوتا تو اس کا بڑا حصہ برباد ہو جاتا۔ اموی دَور میں اسلامی علوم و فنون میں بہت وسعت اور ترقی ہوئی۔ تابعین عظام جو اموی دَور کے رُوح رواں تھے۔ انہوں نے دینی علوم کی اشاعت میں ایک اہم کردار ادا کیا ہے۔

درس و تدریس کا سلسلہ جاری کیا۔ اور بڑے بڑے ائمہ کرام اور محدثین عظام اسی دور میں پیدا ہوئے۔

تفسیر | تفسیر قرآن کی ابتدا نزولِ قرآن کے ساتھ ہی ہوگئی تھی۔ پھر اس میں برابر وسعت ہوتی گئی۔ اموی دور میں بڑے بڑے ائمہ کرام پیدا ہوئے۔ جنہوں نے تفسیر قرآن کے سلسلے میں بہت علمی کارنامے سرانجام دیئے۔ طبقہ تابعین میں تفسیر قرآن کے جاننے والوں میں زیادہ تر حضرات ہیں۔ اور یہ سب ترجمان القرآن حضرت عبداللہ بن عباسؓ کے شاگرد تھے۔ مثلاً عکرمہ، قتادہ، سعد بن جبیرؒ اور حسن بصری۔ ان حضرات کو اموی دور کے مفسرین میں شمار کیا جاتا ہے۔ تفسیری روایات کا دار و مدار زیادہ تر انہی بزرگوں کی روایات پر ہے۔ یہ دور تفسیری تصنیفات کا نہیں بلکہ تفسیر قرآن، ان کی تشریح و تفصیل اور علمی تحقیق کا تھا۔ اسی دور میں حضرت سفیان بن عیینہ (م ۱۹۸ھ) اور حضرت وکیع بن الجراح (م ۱۹۷ھ) کے نام بھی ملتے ہیں۔ یہ دونوں حضرات تبع تابعین کے مقدس گروہ سے تعلق رکھتے تھے۔ ان حضرات نے اپنی دینی بصیرت سے ایسی شمع روشن کردی تھی، جس نے بعد کے مفسرین کرام کے لیے آسانی پیدا کر دی۔ حضرت سفیان بن عیینہ اور حضرت وکیع بن الجراح کے علاوہ حضرت امام شعبہ (م ۱۶۰ھ) اور حضرت سفیان ثوری (م ۱۶۱ھ) کے نام بھی ملتے ہیں۔ جنہوں نے قرآن کریم کی تفسیر و تشریح میں حصہ لیا۔ اس عہد میں آج کل کی تفسیروں کی طرح پورے قرآن مجید کی تفسیر تو مرتب نہ ہو سکی۔ بلکہ متفرق آیات کی تفسیری روایات جمع کی گئیں۔

حدیث | اس عہد میں حدیث کی تدوین و ترتیب اور اس کی نقل و روایت کا جتنا کام ہوا۔ وہ دوسری صدی ہجری میں نہیں ہوا۔ حضرت امیر معاویہؓ خود ایک صحابی تھے۔ آپ کے دورِ سلطنت میں بکثرت صحابہ کرام موجود تھے۔ جو اپنے سینوں میں دینی علوم کا عظیم سرمایہ محفوظ رکھتے تھے۔ مکہ مکرمہ میں حدیث کے عظیم ستون اور محافظ موجود تھے۔ حضرت مجاہد (م ۱۰۳ھ) حضرت عطا بن رباح (م ۱۱۴ھ) حضرت عکرمہ مولیٰ ابن عباس (م ۱۰۵ھ) حضرت طاؤس بن کیسان (م ۱۰۶ھ) یہ سب حضرات عبداللہ ابن عباسؓ کے تلامذہ میں سے تھے۔ اور یہ سب حضرات اپنے علمی تبحر اور فضل و کمال کے لحاظ سے ایک ممتاز مقام کے حامل تھے۔

مدینہ طیبہ علماء و فضلاء کا مخزن تھا۔ عہد نبوی سے لے کر حضرت علیؓ کی خلافت کے ابتدائی زمانے تک ساری دنیائے اسلام کا مرکز یہی تھا۔

حضرت شاہ ولی اللہ دہلوی (م ۱۱۷۶ھ) فرماتے ہیں۔

باید دانست کہ مدینہ مشرفہ در زمانِ او بیشتر از زمان متاخر بلاشبہ مرجعِ فضلاء و محط رجال علماء بودہ است[1]

جاننا چاہیے کہ مدینہ طیبہ اخیر دور سے پہلے بلاشبہ فضلا کا مرجع اور اہلِ علم کا فرودگاہ تھا۔ البتہ امام مالکؒ کے طبقہ کے بعد وہاں علمی انحطاط آ گیا تھا۔

امام ابن شہاب زہری (م ۱۲۴ھ) احادیث کی تلاش و جستجو میں مدینہ کی گلیوں کا چکر لگاتے۔ اور ہر مرد، عورت اور جوان سے استفادہ کرتے تھے[2]۔ امام مکحول نے حدیث کی تلاش و جستجو میں بہت سے ممالک کے سفر کیے اور تابعین نے حدیث کی تلاش و جستجو میں جو کوششیں کیں، اسماء الرجال کی کتابوں میں اس کی تفصیل ملتی ہے۔ ہر گھر اور ہر مسجد سے قال قال رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی آواز سنائی دیتی تھی۔

امام مالک مدینۃ النبی صلی اللہ علیہ وسلم میں پیدا ہوئے۔ مدینہ ہی میں آپ نے تعلیم حاصل کی۔ حضرت نافع (م ۱۱۷ھ) جو حضرت عبداللہ بن عمرؓ کے تلمیذ رشید تھے اور کامل ۳۰ سال تک حضرت ابن عمرؓ کی خدمت میں گزارے تھے۔ ان سے استفادہ کیا اور ۱۲ سال حضرت امام مالکؒ حضرت نافع کی خدمت میں رہے۔ اور حضرت نافع کی وفات کے بعد حضرت امام مالک ان کے جانشین ہوئے۔

مدینہ کے بعد کوفہ کا نام آتا ہے جو اسلام کی وسعت و تمدن کا دیباچہ تھا۔ حافظ ابن قیمؒ (م ۷۵۱ھ) لکھتے ہیں۔

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے بعد علم نبوت کے تین مراکز تھے۔ مکہ، مدینہ اور کوفہ۔ مکہ معظمہ کے صدر معلم حضرت ابن عباسؓ تھے۔ اور مدینہ طیبہ کے

---

[1] مصفی شرح موطا امام مالکؒ۔ [2] مسند دارمی ص ۴۷۔

حضرت ابن عمرؓ اور کوفہ کے حضرت عبداللہ بن مسعودؓ تھے۔[1]

حضرت علیؓ نے اس شہر کو دار السلطنت بنایا تھا۔ اور کوفہ عہد فاروقی میں قرآن و سنت کا مرکز بن چکا تھا۔ حضرت علیؓ اور حضرت عبداللہ بن مسعودؓ کے اکثر تلامذہ نے یہاں اسلام کی شمع روشن کر رکھی تھی۔

بنی اُمیہ کے دَور میں جس طرح اربابِ علم وفضل نے تفسیر پر قلم نہیں اُٹھایا۔ اسی طرح حدیث پر بھی قلم نہیں اُٹھایا۔ بلکہ محض روایات کو دوسروں تک پہنچایا۔ اور درس و تدریس کے ذریعے احادیثِ نبوی صلی اللہ علیہ وسلم کی اشاعت کی۔ اور ان کو اپنے سینوں میں محفوظ رکھا۔ حضرت عمر بن عبد العزیز (م ۱۰۱ھ) جن کے دَور کو خلافتِ راشدہ کا دَور کہا جاتا ہے۔ علامہ ابن خلدون (م ۸۰۸ھ) اپنے مقدمہ میں لکھتے ہیں:

وتوسطهم عمر بن عبد العزيز فنزع الى طريقة الخلفاء الاربعة والصحابة جهده۔

حضرت عمر بن عبد العزیز مروانی سلسلہ کی درمیانی کڑی تھے۔ انہوں نے اپنی تمام تر توجہ خلفائے راشدین اور صحابہ کرامؓ کے طریقے کی طرف مبذول کی۔

موطا، بخاری، مسلم اور حدیث کی دوسری کتابیں جو احادیثِ صحیحہ کا بہترین مجموعہ ہیں۔ اس وقت تک وجود میں نہیں آئی تھیں۔ حضرت عمر بن عبد العزیز نے اس طرف توجہ نہ کی ہوتی تو علم حدیث کا یہ ذخیرہ وجود میں نہ آتا۔ لیکن انہوں نے دیکھا کہ انقضائے زمانہ کے ساتھ علمائے کرام کا گروہ روز بروز مٹتا جارہا ہے۔ اور اس کے ساتھ علوم شرعیہ کے مٹ جانے کا بھی اندیشہ ہے۔ اس لیے انہوں نے قاضی ابوبکر بن حزم گورنر مدینہ کو لکھا:

انظر ما كان من حديث رسول الله صلى الله عليه وسلم فاكتبه فانى خفت دروس العلم وذهاب العلماء ولا يقبل

---

[1] اعلام الموقعین۔

الاحادیث النبی صلی اللہ علیہ وسلم [1]

احادیثِ نبویہ کی تلاش کر کے ان کو لو۔ کیونکہ مجھے علم کے مٹنے اور علماء کے فنا ہونے کا خوف معلوم ہوتا ہے۔ اور صرف آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی حدیث قبول کی جائے۔

حافظ ابن حجر عسقلانی (م ۸۵۲ھ) کی تحقیق یہ ہے کہ یہ حکم صرف مدینہ اور مدینہ کے گورنر کے لیے مخصوص نہ تھا۔ بلکہ انہوں نے یہ فرمان تمام صوبوں کے گورنروں کے نام بھیجا تھا۔ حافظ صاحب فرماتے ہیں:

کتب عمر بن عبد العزیز الی الآفاق انظروا حدیث رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم فاجمعوا۔

حضرت عمر بن عبد العزیز نے تمام گورنروں کے نام یہ پیغام بھیجا کہ حدیث رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو جمع کیا جائے۔

بہر حال حضرت عمر بن عبد العزیز کے اس فرمان کی تعمیل کی گئی اور جمع شدہ احادیث کے متعلق تمام مجموعے تیار کیے گئے۔ اور اس کے بعد تمام ممالک محروسہ میں ان کو تقسیم کیا گیا۔ علامہ ابن عبد البر قرطبی (م ۴۶۳ھ) لکھتے ہیں کہ سعد ابن ابراہیم نے روایت کیا ہے۔

امرنا عمر بن عبد العزیز بجمع السنن فکتبناها دفترا دفترا فبعث الی کل ارض له علیها سلطان دفترا [2]

ہم کو حضرت عمر بن عبد العزیز نے جمع حدیث کا حکم دیا اور ہم نے دفتر کی دفتر حدیثیں لکھیں۔ اور انہوں نے ایک مجموعہ ہر جگہ جہاں جہاں ان کی حکومت تھی بھیجا۔

بعض مؤرخین نے یہ صراحت کی ہے کہ حضرت عمر بن عبد العزیز (م ۱۰۱ھ) سے پہلے حضرت امام ابن شہاب زہری (م ۱۲۴ھ) نے تدوینِ حدیث کا کام شروع کیا تھا۔

---

[1] بخاری کتاب العلم باب کیف یقبض العلم۔

[2] جامع بیان العلم ص ۳۸۔

فقہ احادیثِ نبویہ صلی اللہ علیہ وسلم کے بعد دوسرا کام یہ تھا کہ دوسرے علوم کی اشاعت و ترویج کی جائے۔ اکثر تابعین و تبع تابعین ہیں اکثر علمائے کرام بیک وقت مفسر بھی تھے، محدث بھی اور فقیہ بھی۔ جو بزرگ محدث تھے انہوں نے حدیث کی خدمت انجام دی اور وہی فقیہ بھی تھے اور انہی کے ذریعہ فقہ کی خدمت بھی انجام پائی۔ مدینہ میں حضرت سعید بن المسیب (م سنہ ۹۴ھ)، عبید اللہ بن عتبہ بن مسعود (م سنہ ۹۸ھ)، عروہ بن زبیر (م سنہ ۹۴ھ) قاسم بن محمد بن ابی بکر (م سنہ ۱۰۸ھ) ابوبکر بن عبد الرحمان بن حارث (م سنہ ۹۴ھ) سلیمان بن یسار (م سنہ ۱۰۹ھ) خارجہ بن زید (م سنہ ۹۹ھ) یہ سب حضرات اپنے زمانہ میں علم فقہ و حدیث کے مرجع تھے۔ ان کا متفقہ فیصلہ مدینہ کی عدالت کا حکم فقہی تسلیم ہوتا تھا۔[1]

کوفہ میں ابراہیم نخعی (م سنہ ۹۵ھ) اسود بن زید (م سنہ ۷۵ھ) علقمہ بن قیس (م سنہ ۱۰۲ھ) ابن ابی مسلم خراسانی (م سنہ ۱۲۹ھ)، محمد بن کعب (م سنہ ۱۱۷ھ) ایسے صاحب علم و فضل و ارباب کمال کو فراموش نہیں کیا جاسکتا۔ غرض کہ اس دور میں ہر طرف علوم دینی کا فروغ تھا۔

حدیث کے بعد فقہ اور دوسرے اسلامی علوم کی نشر و اشاعت میں بھی حضرت عمر بن عبد العزیز (م سنہ ۱۰۱ھ) نے دلچسپی لی، چنانچہ آپ نے گورنر مدینہ قاضی ابوبکر بن حزم کو لکھا اور ان کی توجہ اس طرف مبذول کرائی۔

ولیفشوا العلم ویجلسوا حتیٰ یعلم من لا یعلم فان العلم لا یهلك حتیٰ یکون سرا۔[2]

لوگوں کو چاہیے کہ عام طور پر علم کی اشاعت کریں اور تعلیم کے لیے حلقہ درس میں بیٹھیں تاکہ جو لوگ نہیں جانتے وہ جان لیں کیونکہ علم اس وقت تک برباد نہیں ہوتا جب تک کہ وہ مخفی نہ رکھا جائے۔

ایک اور گورنر کے نام خلیفۂ راشد حضرت عمر بن عبد العزیز نے لکھا کہ:

اما بعد فامر اهل العلم ان ینشروا العلم فی مساجدهم

---

[1] الجواہر المضیئہ جلد ۲ ص ۲۱۴۔

[2] سیرۃ عمر بن عبد العزیز ابن جوزی (م سنہ ۵۹۷ھ)

فان السنة كانت قد اميتت[1]

اہل علم کو حکم دو کہ اپنی مسجدوں میں علم کی اشاعت کریں۔ کیوں کہ سنّت بے جان یعنی مر چکی ہے۔

جو لوگ اس مقدس کام میں مصروف ہوتے۔ ان کو فکر معاش و ضروریاتِ زندگی سے بالکل بے نیاز کر دیا۔ چنانچہ گورنر حمص کے نام ایک خط میں لکھا،

انظروا الى القوم الذين نصبوا انفسهم للفقه وحبسوها فى المسجد عن طلب الدنيا فاعط كل رجل منهم مائة دينار يستعينون بها على ماهم عليه من بيت مال المسلمين حين يأتيك كتابي هذا۔[2]

جن لوگوں نے دُنیا چھوڑ کر اپنے آپ کو فقہ کی تعلیم کے لیے وقف کر رکھا ہے۔ ان میں ہر ایک کو جس وقت میرا خط پہنچے، بیت المال سے سَو دینار دو تاکہ وہ لوگ اس حالت کو قائم رکھ سکیں۔

افتاء کا محکمہ گو...... خلافتِ راشدہ کے عہد میں وجود میں آ چکا تھا۔ حافظ ابن القیم (م ۷۵۱ھ) لکھتے ہیں،

فتویٰ دینے میں صحابہ کرامؓ کے تین طبقے ہیں:

مکثرین۔ جن سے بکثرت فتاوٰی منقول ہیں۔

متوسطین۔ اس طبقہ سے فتاوٰی کثرت سے منقول نہیں ہیں۔ البتہ ایک معتدبہ تعداد اس طبقے سے ہم تک پہنچی ہے۔

مقلین۔ جن سے بہت کم تعداد میں فتاوٰی مروی ہیں۔

مکثرین کی تعداد سات ہے اور وہ یہ ہیں۔ ۱۔ عمر بن خطابؓ (۲) علی بن ابی طالبؓ

---

[1] سیرۃ عمر بن عبد العزیز ابن جوزی (م ۵۹۷ھ) ص ۹۴۔

[2] سیرۃ عمر بن عبد العزیز ص ۹۵۔

۳- عبداللہ بن مسعودؓ ۴- اُم المومنین عائشہؓ (۵) زید بن ثابتؓ (۶) عبداللہ بن عباسؓ۔
۷- عبداللہ بن عمرؓ۔

متوسطین طبقہ میں درج ذیل صحابہ کرام شمار کیے جاسکتے ہیں۔

ا- ابوبکر صدیقؓ ۲- ام سلمہؓ ۳- انس بن مالکؓ۔ ۴- ابوسعید خدریؓ ۵- ابوہریرہؓ
۶- عثمان بن عفانؓ۔ ۷- سعد بن ابی وقاصؓ ۸- سلمان فارسیؓ ۹- جابر بن عبداللہؓ
۱۰- معاذ بن جبلؓ ۱۱- طلحہؓ ۱۲- زبیر بن العوامؓ ۱۳- عبدالرحمٰن بن عوفؓ۔
۱۴- عمران بن حصینؓ ۱۵- عبادہ بن الصامتؓ ۱۶- معاویہ بن ابی سفیانؓ۔

مذکورہ بالا صحابہ کرامؓ کے علاوہ باقی صحابہ کرام کا شمار مقلین (طبقہ ثالثہ) میں ہے اور ان میں ایسے صحابہ کرام بھی شامل ہیں جن سے صرف ایک یا دو فتاویٰ منقول ہیں[1]۔

بنو امیہ کے دور میں محکمہ افتاء میں وسعت پیدا ہوئی۔ حضرت عمر بن عبدالعزیزؒ نے اپنے مختصر دورِ حکومت میں اس طرف خاص توجہ کی اور آپ نے افتاء کے سلسلے میں ان لوگوں کو مقرر کیا جو اس کے اہل تھے۔ مثلاً مصر میں حضرت عمر بن عبدالعزیز نے یزید بن ابی حبیب کو افتاء کے لیے مقرر کیا۔ یزید بن ابی حبیب نے مصر میں فقہ و حدیث کی تعلیم کو عام کیا اور اہلِ مصر کو اس سے روشناس کرایا۔ علامہ جلال الدین سیوطی (م ۹۱۱ھ) لکھتے ہیں:

هو اول من اظهر العلم بمصر والمسائل فی الحلال والحرام وقبل ذالك كانوا يتحدثون فی الترغیب والملاحم والفتن وهو احد ثلاثة جعل اليهم عمر بن عبد العزيز الفتيا۔[2]

وہ پہلے شخص ہیں جنہوں نے مصر میں علم کو ظاہر کیا اور حلال و حرام کے مسائل کو رواج دیا۔ وہاں کے لوگ اس سے پہلے صرف ترغیب اور جنگ وغیرہ کے متعلق روایت کرتے تھے۔ وہ ان تین اشخاص میں ہیں جن کے متعلق حضرت عمر بن عبدالعزیز نے افتاء کی خدمت کی تھی۔

---

[1] اعلام الموقعین جلد ۱ ص ۵۸ [2] حسن المحاضرہ جلد ۱ ص ۱۲۰۔

مغازی و سیرت اسی دور میں تاریخ کا آغاز ہوا۔ اور اس کی ابتدا مغازی اور سیرت سے ہوئی۔ اسلام کی ابتدائی تاریخ انہی دونوں سے عبارت ہے۔ صحابہ و تابعین اور تبع تابعین میں ان کے علماء موجود تھے۔ کشف الظنون کے بیان سے معلوم ہوتا ہے کہ مغازی اور سیرت پر سب سے پہلی کتاب عروہ بن زبیر (م ۹۴ھ) نے لکھی تھی[1] حضرت عمر بن عبدالعزیز نے خاص طور پر اس طرف توجہ کی۔ اور عاصم بن عمر بن قتادہ جو مغازی اور سیرت میں کمال رکھتے تھے، ان کو حکم دیا کہ وہ مسجد دمشق میں مغازی پر درس دیں[2]

اموی دور میں تفسیر، حدیث، فقہ اور مغازی و سیرت کے علاوہ دوسرے علوم کی طرف بھی خاص توجہ کی گئی۔ انساب عربوں کا پرانا علم تھا جو ہر زمانہ میں قائم رہا۔ اور بنی امیہ کو عربیت کے تحفظ میں بڑا اہتمام تھا۔ اور ان کی حکومت کے استحکام میں قبائلی عصبیت کو بڑا دخل تھا۔ اس لیے انہوں نے انساب کی طرف خاص توجہ کی۔ امام محمد بن سیرین، سعید بن مسیب اور محمد بن سائب کلبی علم انساب کے بہت بڑے ماہر تھے اور آئندہ علم الانساب نے جو ترقی کی اس کا بڑا ماخذ انہی کی روایات تھیں

علم لغت کی بنیاد خلفائے راشدین ہی کے زمانے میں پڑ چکی تھی۔ لیکن اس کی علمی تدوین اور اس کی ترقی و ترویج اموی دور میں شروع ہوئی۔ جمہور علماء کرام کا قول ہے کہ علم لغت کے جانے بغیر کتاب اللہ کی تفسیر کرنا جائز نہیں ہے[3] اسی دور کے دو بڑے امام لغت تھے۔ قتادہ بن دعامہ سدوسی (م ۱۱۷ھ) اور ابو عمرو بن العلاء (م ۱۵۴ھ)۔ ابو عمرو نے زبان و لغت کی تحصیل کے لیے برسوں صحرائے عرب کی خاک چھانی تھی۔ اور اس کے متعلق بہت قیمتی مواد فراہم کیا[4] قتادہ، اشعار، انساب و لغت میں بہت وسیع علم رکھتے تھے اور اموی خلفاء ان فنون کی تحقیق کے سلسلے میں ان کی طرف رجوع کرتے تھے[5]

---

[1] کشف الظنون جلد ۳ ص ۴۰۰

[2] تہذیب التہذیب ابن حجر عسقلانی ترجمہ عاصم بن عمر بن قتادہ۔

[3] اتقان فی علوم القرآن للسیوطی ج۔

[4] تاریخ ابن خلکان تذکرہ ابو عمرو و معجم الادباء جلد ۴ ص ۱۲۔

[5] معجم الادباء جلد ۶ ص ۲۰۲

علمِ نحو کی ابتداء بھی خلافتِ راشدہ کے عہد میں ہو چکی تھی۔ اور حضرت علی بن ابی طالب کی ہدایت پر اُن کے شاگرد ابوالاسود نے اس کے چند اُصولی قواعد مرتب کیے تھے۔ لیکن اموی دور میں اس فن کی خوب ترقی و ترویج ہوئی۔ اور عیسیٰ بن عمرو ثقفی (م ۱۴۷ھ) نے اس فن پر دو کتابیں تصنیف کیں۔ ایک کتاب الجامع اور دوسری کتاب المکمل [۱] اسی دور میں قرآن مجید معری تھا۔ اہل عرب اس کو بغیر اعراب کے پڑھ لیتے تھے۔ مگر جب عجمی قومیں مسلمان ہوئیں تو یہ لوگ پڑھنے میں غلطی کرتے تھے تو اموی گورنر حجاج بن یوسف ثقفی نے قرآن مجید پر اعراب اور نقطے لگوائے [۲]

عربی اور دینی علوم کے علاوہ غیر قوموں کے علوم کے تراجم کا آغاز بھی اموی دور میں ہوا۔ حضرت عمر بن عبدالعزیز نے غیر قوموں کے مفید علوم کی اشاعت کی طرف توجہ کی۔ مروان بن حکم کے زمانہ میں ایک یونانی حکیم ایرن القس کی ایک مشہور کتاب تھی، جس کا ترجمہ عربی زبان میں ایک اسرائیلی طبیب ماسرجویہ نے عربی زبان میں کیا تھا۔ اور اس کا نسخہ شاہی کتب خانہ میں موجود تھا۔ حضرت عمر بن عبدالعزیز نے اس کتاب کو عام فائدہ کے لیے شائع کیا [۳]

بنو امیہ کے دور میں لوگوں کے پاس ذاتی کتب خانے بھی تھے۔ امام حسن بصریؒ، ابو قلابہؒ، اور ابن شہاب زہری کے پاس کتابوں کا کافی ذخیرہ تھا۔ امام زہری جب گھر میں مطالعہ کے لیے بیٹھتے تو ارد گرد کتابوں کا ڈھیر ہوتا اور دُنیا و ما فیہا سے بے خبر ہو جاتے۔ ان کی بیوی کہا کرتی تھی کہ ان کتابوں کا "جلاپا" تین سوتوں سے بڑھ کر ہے [۴] شاہی کتب خانہ بھی تھا۔ حضرت عمر بن عبدالعزیز نے یونانی حکیم ایرن القس کی قرابادین شاہی کتب خانہ سے لے کر شائع کی تھی۔

اموی دور میں علوم اسلامی کی جو اشاعت ہوئی اور اس سلسلہ میں اموی حکمرانوں نے جو دلچسپی لی اُس کی ایک جھلک آپ نے ملاحظہ فرمالی۔ اور اس حقیقت سے بھی انکار نہیں ہو سکتا کہ اس دور میں علوم اسلامی نے خوب ترقی کی۔

---

[۱] فہرست ابن ندیم ص ۶۲ — [۲] ایضاً

[۳] اخبار الحکماء ص ۲۱۳ — [۴] ابن خلکان جلد ۱ ص ۴۵۱۔

انسائیکلوپیڈیا آف اسلام (انگریزی) کی تیاری میں

برِصغیر کے مسلمانوں کا حصہ ——— ایک تنقیدی جائزہ

از جناب ممتاز علی صاحب

(۲)

مسلمانوں کے مضامین کے موضوعات برصغیر کے اِن مصنّفین نے جن موضوعات پر مضامین لکھے ہیں ان میں زیادہ تر ہندوستان کے صوفیاء، علمائے اسلام، مسلم شعراء اور مسلم مصنّفین کے حالاتِ زندگی اور ان کے کارناموں کے علاوہ ہندوستان میں مسلمانوں کی آمد، مسلم سوسائٹی اور تہذیب و تمدّن کا ارتقاء، اسلامی مدارس کا قیام اور ان کا کردار، مسلم دورِ حکومت میں اسلامی علوم و فنون کا ارتقاء مسلم حکمرانوں کا طریقۂ حکمرانی، مسلم دورِ حکومت میں آباد کیے گئے شہروں اور مسلم دورِ حکومت کے مختلف صوبوں کے تعلق سے مقالات قلم بند کیے گئے ہیں۔

صوفیاء، شعراء اور مسلمانوں کے بسائے ہوئے شہروں کے بارے میں تفصیلی نوعیت کے مضامین لکھے گئے ہیں۔ علمائے اسلام اور مجدّدین کے حالات اور کارنامے نہایت ہی اختصار کے ساتھ بیان کیے گئے ہیں۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ ہندوستان کے صوفیا اور شعراء کو یہاں کے مسلم ہیروز کے طور پر پیش کیا گیا ہے۔ برخلاف اس کے علماء اور مجدّدین کے تعلق سے یہ تاثر دینے کی کوشش کی گئی ہے کہ علماء و مجدّدین کے اس قدامت پرست گروہ نے محض دقیانوسی مذہب اسلام اور مسلمانوں کو سیاسی طور پر غالب کرنے کی کوششیں کی ہیں۔

یہاں ہم تمام مضامین کا احاطہ نہ کرتے ہوئے مثال کے طور پر صرف ہندوستان میں احیائے اسلام کے لیے جدوجہد کرنے والے علمائے اسلام اور مجدّدین پر لکھے گئے مضامین کا جائزہ لیں گے۔

شاہ عنایت اللہ نے شیخ احمد سرہندیؒ کے حالاتِ زندگی بیان کرتے ہوئے ان کی تصانیف کا تذکرہ کیا ہے۔ چنانچہ ان کے کارناموں میں سب سے زیادہ اہم کارنامہ اُن کے وہ خطوط بتلائے گئے ہیں جو

انہوں نے اپنے شاگردوں کے نام لکھے تھے جن میں اسلام کے متعلق کئی اہم موضوعات زیر بحث لائے گئے ہیں۔ شاہ عنایت اللہ نے شیخ احمد سرہندی کے تعلق سے مزید لکھا ہے کہ انہوں نے ہندوستان میں ISLAM ORTHODOX کو قائم کرنے کی کوشش کی۔ اسی طرح یہ تاثر دینے کی کوشش کی گئی ہے کہ حضرت شیخ احمدؒ سرہندی کو وقت کے جدید تقاضوں سے کوئی دلچسپی نہیں تھی[۱]۔ اس مختصر ذکر کے بعد شاہ عنایت اللہ نے سید احمدؒ بریلوی کے بارے میں لکھتے ہوئے انہیں ایک مذہبی جنگ جو مصلح کی حیثیت سے پیش کیا ہے۔ سید احمدؒ بریلوی کے تعلق سے شاہ عنایت نے مزید لکھا ہے کہ انہوں نے ہندوستان میں مسلمانوں کے غلبہ کے لیے جدوجہد کی اور یہ اس وقت تک ممکن نہ تھا جب تک کہ ہندوستان سے انگریزوں کو اور پنجاب سے سکھوں کو بے دخل نہ کر دیا جائے۔ چنانچہ اس کے لیے انہوں نے جہاد کی تیاریاں شروع کر دیں (یہاں شاہ عنایت اللہ نے لفظ جہاد کے بجائے مذہبی جنگ لکھا ہے) سید احمد بریلوی کا نجد کے محمد بن عبدالوہاب سے موازنہ کرتے ہوئے لکھتے ہیں کہ سید احمد بریلوی نے نجد کے محمد بن عبدالوہاب کی طرح ایک سیدھے سادھے حقیقی اسلام کو اختیار کرنے کی دعوت دی[۲]۔

[۱] ۔ ایس بزمی انصاری نے شاہ ولی اللہ دہلوی کے تذکرے میں لکھا ہے کہ وہ ہندوستان کے عظیم انقلابی مفکر تھے۔ جنہیں ISLAMIC MODERNISM کا بانی کہا جاتا ہے۔ لیکن انہوں نے جو تحریک شروع کی وہ بہت جلد ناکام ہو گئی۔ کیونکہ وہ وقت سے بہت پہلے شروع کی گئی تھی۔ اور جب ان کی اس تحریک کا وقت کی حقیقی قوتوں سے سامنا ہوا تو وہ اس کے سامنے زیادہ دیر تک نہ ٹھہر سکی اور آخر کار دم توڑ دیا۔ بزمی انصاری مزید لکھتے ہیں کہ شاہ صاحب اور ان کے جانشینوں نے اپنے وقت کے ان اثرات کا جائزہ لینے میں بھی غلطی کی جو مشرق و مغرب کے تصادم اور عصری طاقت اور رجحانات کی وجہ سے پیدا ہو رہے تھے جس کا ناگزیر نتیجہ یہ نکلا کہ ان کا مشن ناکام ہوا۔

---

[۱] مزید تفصیلات کے لیے دیکھیے انسائیکلو پیڈیا آف اسلام (انگریزی) کے نئے ایڈیشن کی جلد اول میں شاہ عنایت اللہ کا مضمون شیخ احمد سرہندی اور سید احمد بریلوی کے بارے میں صفحات ۲۸۲ اور ۲۹۷ مطبوعہ ای جے برل۔ لیڈن ۱۹۶۰ء۔ [۲] ایضاً

اس مختصر سے ذکر کے بعد شاہ صاحب کی تصانیف کا تعارف کرایا گیا ہے [۱]

بزمی انصاری نے سید اسمٰعیل شہیدؒ کے بارے میں لکھا ہے کہ انہوں نے حج سے واپسی کے بعد سکھوں کے خلاف جہاد کا نعرہ بلند کیا۔ اور انگریزوں کے تعلق سے خاموشی اختیار کی جس کی وجہ سے انگریز حکمرانوں نے بھی ان کے اس نعرے سے صرفِ نظر کر لیا۔ آخر کار دسمبر ۱۸۲۶ء میں سکھوں کے خلاف مقدس جنگ کا آغاز کیا جس میں انہیں کامیابی ملی اور انہوں نے پشاور کو صدر مقام بنا کر اپنی حکومت کا باضابطہ آغاز کیا۔ جہاں چند اصلاحات نافذ کی گئیں جن میں بیواؤں کی دوسری شادی کی اجازت اور عشر کی وصولی کا نظم شامل تھیں۔ ان اصلاحات کی وجہ سے مقامی آبادی ان کی مخالف ہو گئی۔ اور انہوں نے عشر وصول کرنے والے عمال کو قتل کیا اور اس طرح مقامی آبادی کی جانب سے ان کی حکومت کو نقصان پہنچایا گیا۔ ان حالات سے فائدہ اٹھاتے ہوئے رنجیت سنگھ نے اُن پر حملہ کر دیا۔ اور اس طرح اسمعیل شہیدؒ اور ان کے رفیق سید احمدؒ بریلوی کو اپنی جانوں سے ہاتھ دھونا پڑا۔ [۲]

پروفیسر خلیق احمد نظامی نے ہندوستان میں مسلم مذہبی فکر کے ارتقاء کے موضوع پر بحث کرتے ہوئے شاہ ولی اللہ دہلویؒ کے سلسلے میں لکھا ہے کہ وہ قرونِ وسطیٰ کے آخری عظیم مفکر تھے۔ جنہوں نے وقت کے تقاضوں کے تحت عقل کی روشنی میں اسلامی فکر کی تشکیلِ جدید کی ضرورت پر زور دیا۔ انہوں نے کہا کہ اسلامی شریعت کو وقت کے تقاضوں کے مطابق ڈھالا جانا چاہیئے تا کہ وہ (شریعت) ایک مخصوص مقام اور مخصوص حالات کے لیے سازگار بن سکے۔ اس عمل کے دوران اُس مخصوص سوسائٹی کے سماجی، مذہبی اور قانونی رجحانات اور رویّوں کو بھی اہمیت دی جانی چاہیے۔ اس DYNAMIC مذہبی APPROACH کی وجہ سے مذہب کی بنیادی قدروں کی تشکیلِ جدید کی نئی نئی راہیں کھلیں [۳]

پروفیسر نظامی اسی موضوع کے تحت سید احمدؒ بریلوی اور سید اسمٰعیل شہیدؒ کے بارے میں لکھتے ہیں

---

[۱] تفصیلات کے لیے دیکھیے انسائیکلوپیڈیا آف اسلام (انگریزی) کے نئے ایڈیشن کی جلد دوم میں اے۔ ایس بزمی انصاری کا مضمون شاہ ولی اللہ صفحہ ۲۵۵۔ مطبوعہ اے جی برل۔ لیڈن ۱۹۶۵ء

[۲] ایضاً

[۳] انسائیکلوپیڈیا آف اسلام جلد سوم صفحہ ۴۳۰۸۔

کہ ان کے یہاں خیالات و افکار میں وہابی نظریہ (وہابی نظریہ سے یہاں پروفیسر نظامی کی مراد محمد بن عبدالوہاب سے ہے) کے اثرات کو محسوس کیا جاسکتا ہے (واضح رہے کہ پروفیسر نظامی نے یہاں مستشرقین کے ہی الفاظ میں محمد بن عبدالوہاب کو وہابی نظریہ سے تعبیر کیا ہے)۔ وہ آگے لکھتے ہیں کہ یہ انہی اثرات کا نتیجہ تھا کہ شہیدین نے ہندوستانی مسلمانوں کے اس رویہ پہ تنقید کی جو غیر اسلامی افکار و نظریات کو اختیار کرنے کے نتیجہ میں پیدا ہو رہا تھا[1]

ہندوستان میں مسلم مذہبی تحریکات کے موضوع پر بحث کرتے ہوئے پروفیسر نظامی نے جماعت اسلامی، تبلیغی جماعت اور قادیانی تحریک کو ایک ساتھ بیان کیا ہے۔ جماعت اسلامی کا ذکر صرف چند جملوں میں کیا گیا ہے۔ وہ لکھتے ہیں کہ مولانا مودودیؒ نے ۱۹۴۱ء میں مذہبی و سیاسی اہمیت کی حامل جماعت اسلامی کی بنیاد رکھی جس کا مقصد قدیم مدارس سے فارغ اور جدید علوم سے آراستہ افراد کو رہنمائی فراہم کرنا تھا۔ (یہاں حوالہ دیا گیا ہے مولانا مودودیؒ کی تصنیف تفہیمات، لاہور ۱۹۴۷ء کا)۔ جماعت اسلامی نے خصوصیت کے ساتھ نوجوانوں میں اشتراکی نظریات کے پھیلاؤ پر گرفت کی لیکن فقط (OURISTS) اور صوفیائے اسلام کے تعلق سے اُن کے نظریات کی وجہ سے مسلمانوں کے مذہبی حلقوں میں اُن کی (جماعت اسلامی) کی پذیرائی نہ ہو سکی[2]

پروفیسر نظامی نے انسائیکلوپیڈیا آف اسلام جیسی کتاب میں قادیانی تحریک کے سلسلے میں لکھا ہے کہ انیسویں صدی کے آخر میں مرزا غلام احمد قادیانی نے ایک نئی مذہبی تحریک شروع کی جو بعد میں آگے چل کر اسلام کا ایک نیا فرقہ بن گئی۔ یہاں پروفیسر نظامی کو اس بات کا علم نہیں کہ تمام مکتبۂ فکر کے علمائے اسلام کے ہاں قادیانی تحریک ہمیشہ ہی ایک غیر اسلامی تحریک رہی ہے[3]

مولانا محمد الیاس کی شروع کی گئی تبلیغی کوششوں کے بارے میں پروفیسر نظامی لکھتے ہیں کہ یہ ایک خالص مذہبی اور روحانی تحریک ہے جو میوات سے شروع ہو کر تمام عرب ممالک میں پھیل گئی۔ اس ضمن میں پروفیسر نظامی کا یہ جملہ بڑی اہمیت کا حامل ہے کہ "حقیقی صورتِ حال یہ ہے کہ اس وقت ہندوستان

---

[1] انسائیکلوپیڈیا آف اسلام جلد سوم صفحہ ۴۳۸

[2] ایضاً " " " [3] ایضاً صفحہ ۴۴۰

ہیں صرف یہی ایک اہمیت کی حامل مسلمانوں کی مذہبی تحریک ہے۔[1]

تبصرہ | انسائیکلوپیڈیا آف اسلام کے نئے ایڈیشن کی ایگزیکٹو کمیٹی کے ایسوسی ایٹ ممبرز کی فہرست میں شامل مسلمان مصنفین کے ناموں اور اس کتاب کی چاروں جلدوں میں شائع کیے گئے مسلمان مصنفین کے مضامین کے چند اقتباسات جو اوپر بیان کیے گئے ہیں۔ یہ بات واضح طور پر سامنے آتی ہے کہ انسائیکلوپیڈیا آف اسلام کی تیاری و پیش کش کے ضمن میں مسلم دانشوروں کی جانب سے جو احتجاج کیا گیا تھا اس کے (RESPONSE) کے طور پر ایسے ہی مسلم مصنفین کو مع ان کی نگارشات کے شامل کیا گیا ہے جو اسلام کے ان مغربی ماہرین کے ان بنیادی مقاصد کی تکمیل میں معاون و مددگار بن سکتے ہوں جن کے حصول کے لیے انٹرنیشنل کانگریس آف اورینٹلسٹس اور اسی قسم کے دوسرے ادارے وجود میں لائے گئے ہیں۔

مستشرقین کی جانب سے پیش کی گئی تصانیف کا جائزہ یوں تو ہر دور میں لیا گیا ہے اور اب بھی لیا جا رہا ہے جس کی ایک عمدہ مثال سہ ماہی مسلم ورلڈ بک ریویو، اسلامک فاؤنڈیشن یو۔ کے اور نیو بکس کوارٹرلی، اسلامک کونسل آف یورپ لنڈن ہے جو پچھلے چند سالوں سے پابندی کے ساتھ شائع کیے جا رہے ہیں۔ جن میں مسلم و غیر مسلم مصنفین کی اسلام اور مسلمانوں کے تعلق سے لکھی جانے والی کتب کا تعارف کرایا جاتا ہے اور تبصرے شائع کیے جاتے ہیں۔ مسلم ورلڈ بک ریویو کو تو اہتمام کے ساتھ عالم اسلام کی تمام ہی جامعات کے کتب خانوں کو بھیجا جانا چاہیے تاکہ عام مسلم طلبا کی اس اہم جرنل تک رسائی ممکن ہو سکے، لیکن ان کوششوں کے باوجود اس بات کی بھی ضرورت محسوس ہوتی ہے کہ مستشرقین کی تصانیف سے استفادہ کے موجودہ طریق کار کو ترک کر کے ایک دوسرا طریقہ کار اختیار کیا جائے۔ اسی ضرورت کے تحت عالم اسلام کی جامعات میں مستشرقین کی کاوشوں ہی کے عنوان سے ایک کورس پڑھایا جائے تاکہ طلبا اور اساتذہ دونوں ہی مستشرقین کی کتب کا تنقیدی نقطہ نظر سے مطالعہ کر سکیں۔ اور طلبا کو یہ معلوم ہو سکے کہ ان کتب میں حقیقی علم کس حد تک پایا جاتا ہے اور تعصب کہاں سے جھلکنا شروع ہوتا ہے۔ اسی کے ساتھ مستشرقین کے کام کا ایک بھرپور جائزہ لے کر ان کی تصانیف پر مشتمل مختصر سے تبصرے کے ساتھ سال میں ایک بار BIBLIOGROPHY ON ORIEN-TALIST WORKS

[1] انسائیکلوپیڈیا آف اسلام، جلد سوم، ص ۱۲۲۔

شائع کی جانی چاہیے۔ اس کام کی انجام دہی کے لیے مغربی ممالک میں آباد چند مسلمان دانشور اور مصنفین آگے آئیں یا پھر عالمِ اسلام کی چند جامعات اس جانب توجہ کریں اور اپنے ہاں اس کام کا آغاز کریں تو مناسب ہوگا۔ ہماری توقعات بے جا نہ ہوں گی۔ اگر ہم سعودی عرب اور پاکستان کی جامعات کی جانب اس غرض کے لیے نظریں اٹھائیں۔

موجودہ حالات میں اس کام کی اہمیت اس وجہ سے اور بھی بڑھ جاتی ہے کہ آج بھی مغرب مختلف ذرائع سے، جن میں علمی ذرائع بھی شامل ہیں، عالمِ اسلام پر اثر انداز ہونے کی کوششوں میں مصروف اور کامیاب ہے۔ خاص کر یہودی لابی اس میدان میں اپنے مقاصد کے لیے ہمیشہ ہی سے سرگرمِ عمل رہی ہے۔ انسائیکلوپیڈیا آف اسلام اور اسی طرح کی دوسری تصانیف سے بھی اس کا اندازہ ہوتا ہے جو اسلام اور مسلمانوں کے مختلف مسائل سے متعلق لکھی جاتی رہی ہیں کہ اُن میں یہودی لابی کا کتنا اہم رول ہے اور وہ کس طرح علمی ذرائع سے بھی دُنیا کی رائے عامہ کو اپنے حق میں ہموار کرنا چاہتی ہے اور اس وقت عالمِ اسلام میں اسلامی تحریکات کی وجہ سے جو ایک عام بیداری کی لہر چل رہی ہے اُس کو ناکام بنانے کے لیے مشرق و مغرب کی عیسائی، یہودی اور اشتراکی طاقتیں جنھیں اسلام سے ہمیشہ خطرہ محسوس ہوتا رہا ہے، پہلے سے کہیں زیادہ تیزی کے ساتھ سرگرمِ عمل ہیں۔ اس کا ثبوت بھی ہزاروں کی تعداد میں شائع کی جانے والی وہ کتب ہیں جن میں آج بھی اسلام، اسلامی تحریکات، اسلامی شخصیات اور مسلمانوں کے تعلق سے زہر اُگلا جارہا ہے۔ اگرچہ کہ لب و لہجہ ماضی کے مقابلے میں کسی حد تک بدل دیا گیا ہے۔ ان حالات میں مسلمانوں پر عموماً اور اسلامی تحریکات کے کارکنوں پر خصوصاً ذمہ داری عائد ہوتی ہے کہ وہ خاموش تماشائی نہ بنے رہیں اور صرف احتجاج تک اپنی سرگرمیوں کو محدود نہ رکھیں بلکہ مخالفینِ اسلام کی ان کوششوں کو ناکام بنانے کے لیے مثبت طریقے اختیار کریں۔

رسائل و مسائل

نام رکھنے میں لفظ "محمد" کا استعمال

از جناب شیخ الحدیث مولانا عبدالمالک صاحب

سوال :- پاکستان کے سکولوں میں پڑھائے جانے والے عربی نصاب میں نام محمدؐ کو عام فقروں میں استعمال کیا گیا ہے اور کئی جگہوں پر ساتھ تصویر بھی بنائی گئی ہے۔ درج ذیل دلائل قابلِ غور ہیں:

۱- جیسے اللہ کریم کا ذاتی نام اللہ ہے ویسے حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کا ذاتی نام محمدؐ ہے جو کہ نہ تو کسی دوسرے کی پہچان ہے اور نہ ہی کسی دوسرے کو اس نام سے پکارا جاسکتا ہے۔

۲- قرآنِ پاک میں اللہ تعالیٰ نے ارشاد فرمایا ہے کہ اے مومنو! تم آپس میں جس طرح ایک دوسرے کا نام لے کر اور چیخ چیخ کر پکارتے ہو اس طرح میرے محبوب کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو نہ پکارنا اگر ایسا کرو گے تو تمہارے اعمال ضائع کر دیئے جائیں گے۔ لَا تَجْعَلُوا دُعَاءَ الرَّسُولِ بَيْنَكُمْ كَدُعَاءِ بَعْضِكُمْ بَعْضًا، پارہ ۱۸، رکوع ۱۵ (لَا تَرْفَعُوا أَصْوَاتَكُمْ ، الیٰ اخر۔

۳- کوئی مسلمان اُس وقت تک مومن نہیں ہوسکتا جب تک کہ وہ محمد صلی اللہ علیہ وسلم کو اپنے ماں باپ، اولاد، جان و مال اور ہر چیز سے زیادہ عزیز نہ سمجھے۔ لَا يُؤْمِنُ أَحَدُكُمْ حَتّٰى أَكُونَ أَحَبَّ إِلَيْهِ مِنْ وَالِدِهٖ - الیٰ اخرہ

۴- وہ مسلمان شخص بڑا ہی بدبخت ہے جس کے سامنے میرا نام لیا جائے اور وہ مجھ پر درود نہ پڑھے۔

۵۔ ایک جگہ ارشاد ہوا کہ تم اپنے لڑکے کا نام محمد رکھو تو اس کی عزت کرو، اس کا ادب کرو، وہ آئے تو اس کے لیے مجلس میں جگہ کشادہ کرو۔ اس کی طرف بُرائی کی نسبت نہ کرو، اس پر بُرائی کی دعا نہ کرو۔ شک نہیں کہ اسی کا نام ادب ہے۔

مندرجہ بالا دلائل دینے سے میں یہ بات واضح کرنا چاہتا ہوں کہ دنیا میں اگر کسی کی پہچان نام محمدؐ ہے تو وہ صرف اور صرف محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی ہے[1]۔ اور اگر کسی دوسرے کو اسی نام سے پکارا جائے گا تو سننے والا اگر مسلمان ہے تو وہ ضرور صلی اللہ علیہ وسلم پڑھے گا، جو کسی دوسرے شخص پر پڑھنا جائز نہیں ——— ہزارہا مسلمان لوگوں نے اپنے بچوں کے نام محمدؐ سے نسبت ظاہر کرنے کے لیے ملا کر رکھے۔ عرب معاشرے میں بھی لوگوں نے اپنے رواج کے مطابق نام رکھے، مگر کوئی بھی نام محمدؐ سے نہیں رکھا گیا۔ بلکہ وہ اس طرح پکارے گئے ——
محمد بن بشیر، محمد بن ابوبکر، محمد بن حارثہ، محمد بن جعفر بن ابی طالب، محمد بن حنفیہ وغیرہ وغیرہ۔ ایسے ہی امام ابوحنیفہ کے شاگرد "امام محمدؒ" کو جب تک امام ابوحنیفہ کا شاگرد اور امام محمد نہ کہا جائے اس وقت تک اگر صرف اور صرف نام محمد لے کر حوالہ دیا جائے تو معلوم نہیں ہو سکے گا۔ دنیا میں آج تک کوئی شخص یہ دعویٰ نہیں کر سکتا کہ اس کو صرف محمدؐ کے نام سے پہچانا گیا ہے۔
ہمارے ہندوستانی اور پاکستانی معاشرے میں اگر لوگوں نے اپنے بچوں کے نام بوقت پیدائش خیر و برکت کے لیے محمد رکھے مگر ان کی پہچان اس نام سے نہیں۔ مثلاً مولانا احمد رضا خاں بریلوی نے بوقت پیدائش بچوں کے نام محمد رکھے مگر وہ پکارے گئے حسن رضا خاں، مصطفےٰ رضا خاں وغیرہ وغیرہ ——— سکولوں میں پڑھائے جانے والے نصاب میں مثال کے طور پر چھٹی جماعت میں پڑھائی جانے والی عربی لازمی کتاب بنام "لغۃ الاسلام" میں درج ذیل فقرات ھَلْ مُحَمَّدٌ مِنْ بَاکِسْتَان بالتصویر ص ۱۳۔ یَا مُحَمَّد مَا ھٰذِہٖ بالتصویر[15]

[1] صاحب مراسلہ نے آغاز میں "وَمَا مُحَمَّدٌ اِلَّا رَسُوْلٌ" کے قرآنی الفاظ بھی درج کیے ہیں۔ مطلوب ان سے بھی استدلال کرنا ہے۔ یہ الفاظ چونکہ بطور عنوان درج تھے، لہٰذا عنوان کی جگہ لفظ "سوال" لکھا گیا۔ اور ان الفاظ قرآنی کو حاشیے میں دیا گیا۔ (مدیر)۔

محمد یشربُ، لَمَآءِ ص ۵۲ - محمد یَفْتَحُ کِتَابَہٗ، بالتصویر ص ۵۴ - اور اسی طرح ص ۵۶، ۶۵ وغیرہ ——— مندرجہ بالا فقرات بول چال میں نام نامی کو بار بار استعمال کیا گیا ہے۔ وضاحت طلب کرنے پر کہا گیا ہے کہ درسی مواد میں محمدؐ ایسے پیارے نام کا استعمال مسلم نوجوانوں میں حبِ نبیؐ پیدا کرنے اور بڑھانے کا ذریعہ اور قلب و نظر کو اسلامی اقدار و تعلیمات سے ہم آہنگ کرنے کا ذریعہ بن سکتا ہے۔ وزارتِ تعلیم کتب میں اسم "محمدؐ" کے استعمال میں حق بجانب ہے ——— آخر میں آپ سب حضرات مسلمان کلمہ گو ہونے کے سبب غور فرمائیں کہ مندرجہ بالا فقرات میں کیا کہیں حضور نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ پیار، محبت اور ادب نظر آتا ہے۔ مصنف نے محمد نام کو پیارا نام کہا ہے مسلم نوجوانوں میں حبِ نبی پیدا کرنے کا وسیلہ بنا ہے۔ یہ کیسا پیار ہے، یہ کیسا وسیلہ ہے۔ کیا ان میں کوئی پیار کی جھلک نظر آتی ہے؟ کیا یہ مقامِ ادب ہے۔ کیا یہ احسانِ عظیم جس کا ذکر قرآن پاک میں فرمایا گیا ہے کہ میں (اللہ) نے تم کو اپنا محبوب عطا فرما کر تم پر احسانِ عظیم کیا ہے۔ کیا مصنف نے اس احسانِ عظیم کو اپنے کندھوں سے اُتار پھینکنے کی مذموم کوشش نہیں کی۔ کیا مصنف نے حضورؐ کے نام کو بول چال میں استعمال کر کے اپنے پُرانے پروگرام پر عمل نہیں کیا۔ جس طرح ماضی میں حضرات صحابہ کرام کے ناموں (زید۔ عمر۔ بکر) کو گرامر میں اور بول چال میں عام استعمال کر کے ان ناموں کو بے وزن کر کے رکھ دیا گیا ہے۔ کیا مصنف کی نیت عیاں نہیں ہے۔ مقامِ ادب ملحوظ ہوتا تو دوسرے کروڑوں ناموں سے فقرات مکمل کیے جا سکتے تھے۔ آخر میں میں آپ سے التجا کرتا ہوں کہ مندرجہ مضمون پر غور فرماتے ہوئے اپنا قیمتی (فتویٰ) جاری فرما کر مشکور و ممنون فرمائیں۔

جواب: آپ کا مطبوعہ استفسار ملا جسے پڑھ کر اندازہ ہوا کہ آپ کو "محمد" کے مبارک نام کے بارے میں بہت بڑی غلط فہمی ہوئی ہے۔ اور آپ اس کے استعمال کو نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے علاوہ کسی دوسرے کے لیے جائز نہیں سمجھتے جس طرح لفظ "اللہ" کا استعمال کسی دوسرے کے لیے جائز نہیں، اسی طرح لفظ "محمد" کا استعمال بھی کسی دوسرے کے لیے بقول آپ کے جائز نہیں۔ جیسا کہ آپ کے استفسار میں پہلے نمبر پر دی گئی دلیل کے الفاظ سے معلوم ہوتا ہے۔

"جیسے اللہ کریم کا ذاتی نام اللہ ہے ویسے حضور نبی کریم کا ذاتی نام محمدؐ ہے جو کہ نہ تو کسی دوسرے کی پہچان ہے اور نہ ہی دوسرے کو اس نام سے پکارا جا سکتا ہے"۔

مزید برآں آپ نے اپنے استفسار کا عنوان " وَمَا مُحَمَّدٌ اِلَّا رَسُوْلٌ " درج کر کے اس آیت سے بھی یہ غلط مفہوم لیا ہے کہ محمد نام صرف رسول کے لیے ہے۔ حالانکہ آیت کا مقصد یہ بتانا ہے کہ محمد صلی اللہ علیہ وسلم صرف اللہ کے رسول ہیں اور آپ کی ذات میں رسالت کی صفات پائی جاتی ہیں نہ کہ خدائی صفات۔

اس کے بعد آپ نے آیت " لا تجعلوا دعاء الرسول " آیت " لا ترفعوا اصواتکم " اور حدیث " لا یومن احدکم " جن میں ذاتِ محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) کے آداب کا ذکر ہے آپ نے لفظ محمد کا ادب سمجھ لیا ہے۔ پھر یہ حدیث کہ " وہ شخص بڑا ہی بدبخت ہے جس کے سامنے میرا نام لیا جائے اور وہ مجھ پر درود نہ پڑھے " کا تعلق بھی لفظِ " محمد " سے نہیں بلکہ ذاتِ محمد سے ہے (صلی اللہ علیہ وسلم)۔ اسی لیے حدیث میں " میرا نام لیا جائے " کے الفاظ ہیں " لفظ محمد بولا جائے " کے الفاظ نہیں ہیں۔ آپ نے اسے بھی لفظ " محمد " کے بولنے کا حکم بنا دیا۔

آپ نے پانچویں نمبر پر جو دلیل دی ہے اگر آپ نے اس کے ان الفاظ پر غور کر لیا ہوتا کہ۔ " تم اپنے لڑکے کا نام محمد رکھو تو اس کی عزت کرو، اس کا ادب کرو، وہ آئے تو اس کے لیے مجلس کشادہ کر دو۔ اس کی طرف بُرائی کی نسبت نہ کرو اور اس پر بُرائی کی نسبت نہ کرو۔" تو آپ اس غلط فہمی کا شکار نہ ہوتے کہ لفظ محمد " نہ کسی دوسرے کی پہچان ہے اور نہ ہی کسی دوسرے کو اس نام سے پکارا جاسکتا ہے "۔ اگر یہ کسی دوسرے کی پہچان نہیں اور اس نام سے کسی دوسرے کو پکارا بھی نہیں جا سکتا تو اس بات کا کیا مطلب ہوگا کہ " تم اپنے لڑکے کا نام محمد رکھو " کیا نام پہچان کے لیے اور پکارنے کے لیے نہیں ہوتا؟ اگر ان اغراض کے لیے نام نہیں ہوتا تو نام رکھنے کی اور کیا غرض ہوتی ہے اور اگر یہ نام کسی کے لیے پہچان نہیں ہے تو پھر اس نام کی بنا پر اس کے لیے ادب اور لحاظ کس بنا پر ہے؟

آپ نے اس سلسلہ میں جو مغالطہ کھایا ہے کہ جن لوگوں کے نام محمد رکھے گئے انہیں ان کی ولدیت کے بغیر کبھی نہیں پکارا گیا۔ وہ بھی عجیب و غریب قسم کا مغالطہ ہے۔ اصل بات یہ ہے کہ عرب بہت سے

لوگ ایک نام میں شامل ہوں تو ان کے تعارف کے وقت ان کی نسبت ذکر کی جاتی ہے۔ مثلاً جب تاریخ میں اس کا ذکر کیا جائے گا یا راوی کی حیثیت سے اس کا تذکرہ کیا جائے گا تو اُس کی نسبت کا تذکرہ ضروری ہوگا اور ایسی صورت میں نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے نام کے ساتھ بھی نسبت کا تذکرہ کیا جاتا ہے اور "محمد بن عبداللہ" کہا جاتا ہے۔ اس کا یہ مطلب نہیں ہے کہ باپ اپنے اس بیٹے کو ولدیت کے ذکر کے بغیر نہ پکارے جس کا نام محمد ہو اور وہ بھی اُسے "یا محمد" نہ کہے بلکہ "یا محمد بن فلاں" کہے اور اس وقت بھی اس نام کے ساتھ درود پڑھے۔[1]

محترم اس سلسلہ میں اصل مسئلہ یہ ہے کہ محمد نام رکھنا جائز ہے۔ اس نام سے یا محمد کہہ کر اس شخص کو پکارنا جائز ہے جس کا نام محمد ہو اور اس نام کا شخص دوسرے نام والوں کی طرح احکام و قوانین کا پابند ہوگا۔ چھوٹوں پر شفقت کرے گا، بڑوں کا ادب کرے گا۔ باپ اور استاد کی خدمت کرے گا نیک کام کرے گا تو اس پر اجر کا مستحق ہوگا، بُرا کام کرے گا تو اس پر اُسے سزا دی جائے گی۔

حدیث میں "محمد کے نام" کی وجہ سے جس ادب کا ذکر کیا گیا ہے، اس کی حد اتنی ہے جتنی حد اچھے ناموں کے لیے رکھی گئی ہے۔ یہ لامحدود نہیں ہے اور اس کا یہ مطلب نہیں ہے کہ اس نام کی بدولت انسان تمام پابندیوں سے بالاتر ہوگیا ہے۔ دراصل جب بچے کا نام رکھا جاتا ہے تو اس میں اچھی توقعات کو بنیاد بنا کر ایسا نام رکھا جاتا ہے جو ان توقعات کا اظہار کرتا ہو۔ بعض اوقات اُونچے درجے پانے والے شخص کے نام کو لے لیا جاتا ہے تاکہ اس نام کا آدمی بھی ان معانی کا مصداق بنے۔ لیکن یہ ماں باپ اور نام رکھنے والے کی آرزوئیں ہوتی ہیں۔ نہ ہی یہ بات کہ اس نام کا شخص لازماً ایسا ہو کہ نام رکھنے والوں کی آرزوئیں اُونچے، متوسط یا ادنیٰ درجے میں پوری ہوں، ضروری نہیں ہے بلکہ عین ممکن ہے کہ وہ اپنے نام کے بالکل برعکس نکلے۔ مختصراً یہ کہ نام ایک وجہ ہے جو رعایت کا مطالبہ کرتی ہے۔ حدیث میں اس کا ذکر کیا گیا ہے اگر کام رعایت کو ختم کر دینے کا تقاضا کرتا ہو تو اُس وقت نام اور کام دونوں

---

[1] کنیت کا جو رواج قرونِ اُولیٰ اور بعد تک رہا، وہ اب بدل گیا ہے۔ اب بہت سی دوسری نسبتیں امتیاز کے لیے استعمال کی جاتی ہیں۔ مثلاً اصغر گونڈوی، علامہ اقبال، احسن فاروقی، کمال سید، جگر مراد آبادی، درد ٹونکی، عباس باوزیری وغیرہ۔

کے تقاضے پورے کیے جائیں گے اور اس شخص کی اتنی ہی رعایت کی جائے گی جس کا وہ مستحق ہے اور سرے سے رعایت کا مستحق نہ رہے تو کوئی رعایت نہ کی جائے گی۔

اس تمہید کی روشنی میں عربی کی کتاب کے بارے میں آپ کے سوال کا جواب یہ ہے کہ اس میں "محمد" سے نبی صلی اللہ علیہ وسلم مراد نہیں ہیں اس لیے "یا محمد ما ھذا" وغیرہ کے کلمات بلاکراہت جائز ہیں۔ البتہ بہتر تھا کہ عنوان میں "محمد" کی ولدیت یا کوئی نسبتِ خاص ذکر کر دی جاتی تاکہ اس بات کی قطعی صراحت ہو جاتی کہ یہاں "محمد" سے فلاں شخص مراد ہے لیکن ایسا کرنا اولیٰ تھا، ضروری نہیں۔ اس لیے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کا ذکر "محمد صلی اللہ علیہ وسلم" کے الفاظ سے ہوتا ہے اگر اس طرح کا عنوان نہ ہو تو اس سے خود بخود بھی یہ معلوم ہو جاتا ہے کہ یہاں محمد سے آپ صلی اللہ علیہ وسلم نہیں بلکہ کوئی دوسرا شخص ہے۔

آپ نے اچھا کیا کہ اہلِ علم سے استصواب و استفسار کے لیے مراسلہ جاری کیا۔ اس طرح کے باریک مسائل کے لیے قرآن و حدیث اور فقہ کے گہرے علم کی ضرورت ہوتی ہے۔ ان علوم میں مہارت کے بغیر کسی بھی شخص کو محض اپنے ذہن میں ایک خیال کو نہیں بٹھا لینا چاہیے۔ اور اس کی بنیاد پر جائز و ناجائز، حلال و حرام کے فتوے دینا تو انتہائی خطرناک راستہ ہے، جس سے بہرحال اجتناب کرنا چاہیے۔

مطبوعات

اسلام میں جرم وسزا | از ڈاکٹر عبدالعزیز عامر۔ عربی سے ترجمہ: از سید معروف شاہ شیرازی (بہ اہتمام ادارہ معارف اسلامی، کراچی) ناشر: البدر پبلی کیشنز — ۲۳۔ راحت مارکیٹ، اردو بازار لاہور۔ صفحات: ۳۵۱۔ قیمت: -/۳۰ روپے۔

بہت مفید اور دلچسپ کتاب ہے۔ مصنف اور مترجم دونوں کی محنت قابلِ قدر ہے۔ میں نے اسے پڑھتے ہوئے متعدد نشانات لگائے، مگر ایسے تمام مقامات کی بحث چھیڑنا ممکن نہیں ہے صرف ایک مقام "زجر و توبیخ" کے عنوان سے ص ۲۱۹، ۲۲۰ پر جو مثالیں عدالتی تعزیر کی حیثیت سے دی گئی ہیں، اُن کے بارے میں یہ ثابت کرنا ضروری تھا کہ ان کی نوعیت معلّمانہ، تربیتی یا مصلحانہ تھی یا عدالتی تھی اور اس کے لیے یہ بھی ضروری ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم یا خلفائے راشدین کے ایسے معاملات کے متعلق یہ تعریف متعین کی جائے کہ کون سی چیزیں عدالتی کارروائی کی تعریف میں آتی ہیں۔ اس کے بغیر ہمارے عدالتی نظام کا ڈھانچہ صحیح طور پر تشکیل پذیر نہیں ہو سکتا۔

کتاب میں مندرج فقہی مسائل اور متعلقہ احوال و ظروف یا اشکال و واقعات کا تعلق ہمارے گذشتہ تمدنی اَدوار سے زیادہ ہے، حالانکہ جدید زمانے کے لوگوں کے سامنے مطالعہ کے لیے قانون و جرم کی کتابیں رکھتے ہوئے آج کل کے احوال و مسائل اور مصطلحات کا خیال بھی رکھنا چاہیے اور جدید اشکال و واقعات اور ان سے متعلق علمی یا قانونی بحثوں کو کم سے کم فٹ نوٹس کی صورت میں ضرور آجانا چاہیے۔ ورنہ لادینیت پسند جدیدیوں کی طرف سے داعیانِ نظامِ اسلامی یا طالبانِ نفاذِ شریعت کا مقابلہ کرنے کے لیے یہ دلیل اکثر استعمال کی جاتی ہے کہ ہمارا پرانا فقہی نظام اپنی محدودیتوں کی وجہ سے دَورِ حاضر میں چل ہی نہیں سکتا اور اسے اگر لاگو کر دیا جائے تو قدم قدم پر لاینحل مشکلات

پیدا ہو جائیں گی۔

مگر یہ بات اپنی جگہ ضروری ہے کہ ہم اپنے سابق علمی ذخیرے کو ہر اُس ملک کی زبان میں منتقل کریں جہاں دعوت و تحریکِ اسلامی کا کام ہو رہا ہو۔ مترجم اگر صرف مترجم ہو تو اُس کی ذمہ داری بڑی محدود ہوتی ہے۔ اگر وہ صاحبِ تحقیق بھی ہو اور جدید مسائل و مباحث سے آگاہی رکھتا ہو تو وہ ترجمہ کرتے ہوئے بھی کم سے کم حواشی کی حد تک ایسی معلومات لا سکتا ہے جو ضروریاتِ وقت کے لحاظ سے تلافی کا ذریعہ ہو جائیں۔

اس قسم کی کتابوں کو اگر ترجمہ کر کے علمی سطح سے اُتار کے عوامی مطالعہ کے لیے لایا جائے تو اس بات کا بھی خیال رکھا جائے کہ مختلف فقہی احکام کے اجمالی تذکروں کو گڈمڈ کرنے سے عوام بلکہ جدید تعلیم یافتہ نوجوانوں کا ذہن بھی نقطۂ نظر کے اختلاف کی اُصولی بنیادیں نہ جاننے کی وجہ سے خاصا ڈانواں ڈول ہوگا۔ مختلف فقیہوں کے احکام سامنے لاتے ہوئے یا تو مقدمے میں اُن کے اُصولی مدرسہ ہائے فکر کی ماہیت بیان کر دینی چاہیے یا متن کے اندر حواشی میں ان کی اُصولی بنیادوں کا تذکرہ کر دینا چاہیے تاکہ حقیقت ناآشنا لوگ اس سے پریشان نہ ہوں کہ ایک ہی معاملے میں ایک امام کچھ حکم دیتا ہے، دوسرا کچھ اور کہتا ہے، یا ایک قاضی ایک طرح فیصلہ کرتا ہے اور دوسرا دوسری طرح۔ لہٰذا میدان ہر کسی کے لیے کھلا ہے۔ مدعا یہ کہ تفصیل میں شریعت اتنی شاخ در شاخ ہو کر سامنے آتی ہے کہ اُس کے لیے یہ تصوّر کرنا مشکل ہو جاتا ہے کہ تمام اختلافی جزئیات کا انحصار ایک ہی ٹھیئے پر ہے۔

THE SHAPE OF BASIC ORGANS IN ISLAMIC STATE	مؤلف: سیّد معروف شاہ شیرازی (احیائے اسلام اکیڈیمی چنار کوٹ)۔ ناشر: منشوراتِ اسلامی

چنار کوٹ ضلع مانسہرہ۔ صفحات: ۷۹ قیمت: ۵۰/- روپے

مؤلف دینی علم اور جدید قانونی علم کے لحاظ سے ایک ممتاز شخصیت ہیں۔ انگریزی میں ان کی یہ کتاب موجودہ حالات میں خصوصی اہمیت رکھتی ہے جب کہ "اسلامی ریاست" اور اس کے اداروں

پر غور و بحث کا سلسلہ جاری ہے۔ ابواب کے لحاظ سے اس کے مشمولات ہیں" اسلامی ریاست کا مقصود" اور" اسلامی ریاست کے بنیادی اجزا کی ہیئت" کے علاوہ ضمیمہ نمبر ۱ میں حکمران کی اطاعت اور اس کے خلاف جدوجہد، ضمیمہ نمبر ۲ میں جملہ مکاتب فکر کے علما کی مرتب کردہ دستوری تجاویز (۱۹۵۱ء)، ضمیمہ نمبر ۳ میں "میثاقِ مدینہ" ضمیمہ نمبر ۴ میں حبلِ رحمت کا خطبہ (حجۃ الوداع) اور ضمیمہ نمبر ۵ میں اسلامی دستور کا ایک نمونہ (خاکہ) جیسی قیمتی تحریریں شامل ہیں۔

اس کتاب کا سب سے زیادہ قابلِ توجہ اور قابلِ بحث حصہ مجھے اس کا دستوری خاکہ ہی معلوم ہوا، مگر اس پر تفصیلی بحث ممکن نہیں۔ البتہ عملاً یہ امر باعثِ مسرت ہے کہ فاضل مؤلف نے جدید احوال اور نئے اداروں کے تجربات کو ملحوظ رکھ کر اپنا خاکہ اس طرح مرتب کیا ہے کہ اس پر اس دور کی جدید اسلامی ریاست استوار ہو سکتی ہے۔ خوشی کی بات یہ ہے کہ اس خاکے کے مندرجات نہ نصوصِ شرعیہ سے ٹکراتے ہیں نہ سیاسیات کے متفق علیہ اصولوں سے۔

ضمیمہ نمبر ۱ کو اس لحاظ سے اہمیت حاصل ہے کہ اس میں حکومت کے خلاف نزاعات سے بچنے کے لیے ایک خاص آخری حد تک جو رجحان نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے امت کو ودیعت کیا ہے۔ اس کے متعلق دلائل سامنے آتے ہیں۔ واضح رہے کہ مسلم سوسائٹی کے متعلق اس کے مؤسس و معلم نے خدائی ہدایت کے تحت ہمیں یہ سبق دیا ہے کہ مسلمانوں میں کسی طور انارکی اور باہمی مار دھاڑ کو راہ نہیں ملنی چاہیے۔ کیونکہ نظم اگر برقرار رہے تو اصلاح کی صورتیں نکل سکتی ہیں۔ لیکن اگر شورش اور انارکی کا ماحول پیدا ہو جائے تو اس میں جتنا امکان اصلاح کا ہوتا ہے اس سے کہیں زیادہ امکان خرابی و تفرقہ کا ہوتا ہے۔ اسی لیے نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے صحابہ سے امر کے متعلق نزاع نہ کرنے کی بیعت بھی لی اور یہ بھی چاہا کہ نقصان اور تکلیف اٹھا کر بھی نظم کو برقرار رکھا جائے۔

البتہ نظم و اطاعت کی آخری حدود بھی بتا دیں۔ ایک تو یہ ہے کہ اگر حاکم میں برائی اور بھلائی ملی جلی ہو تو نجات وہ پائے گا جو نہ تو برائی کو اختیار کرے، نہ اس کو پسند کرے (ام سلمہ)۔ دوسری یہ کہ جب تک تمھارے جابر حاکم بھی اہتمامِ نماز کرتے رہیں تو ان کے مقابلے کے لیے نہ اٹھو۔ (ام سلمہ) مطلب یہ کہ مسلم سوسائٹی کی اس اہم ترین بنیاد کے ہادموں کا معاملہ الگ ہے۔ تیسری یہ کہ جب معصیت کا حکم دیا جائے تو پھر کوئی سمع و طاعت نہیں ہے (ابن عمر) اور چوتھی یہ کہ امام قوم کا راعی ہے اور

اپنی رعیت کے لیے جوابدہ ہے۔ (ابن عمر)۔ جواب دہی کے یہ معنی کافی نہ ہوں گے کہ کوئی شخص خط لکھے اور اس کو مطابقِ حقیقت یا مغالطہ انگیز جواب مل جائے یا کھلی کچہری میں لوگ کوئی سوال کریں تو امام جواب دے دے۔ نہیں بلکہ جواب دہی کا صحیح مقام عدالت ہے۔ اور شیرازی صاحب نے اپنے خاکے میں عدالت کو یہ مقام دیا ہے کہ کوئی مدعی یا محتسب اعلیٰ یا کوئی ادارہ حاکم کو طلب کر سکتا ہے۔

دستوری خاکے میں کچھ چیزیں اُنہوں نے مبہم چھوڑی ہیں۔ ان میں سے ایک یہ بھی ہے کہ مجلس شوریٰ اپنے فیصلے کس طرح کرے گی۔ دوسری یہ کہ اگر حاکم یا امیر اور مجلسِ شوریٰ میں نزاع واقع ہو تو کس کا حکم چلے گا۔ شوریٰ کا فیصلہ برتر ہوگا یا امیر کا۔ یا کیا آئے دن معاملات عدالت میں چلتے رہیں گے؟

بہر حال سید معروف شاہ صاحب کی کتاب کی ہم قدر کرتے ہیں۔

تنظیم ۔۔ اشاعتِ خصوصی | مدیران: پروفیسر سید محمد سلیم و مجلس ادارت۔ باہتمام ادارۂ تعلیمی تحقیق "تنظیم اساتذۂ پاکستان"۔ دفتر: ۸۔ اے ذیلدار پارک، اچھرہ لاہور۔

تنظیم ایک مجلہ ہے جس کا شمارہ جون سامنے ہے۔ یہ اشاعتِ خصوصی ہے جس کا عنوان ہے "تعلیم و تربیت اسلامی تناظر میں"۔

پروفیسر صاحبان و اساتذہ کرام کی جس کل پاکستان تنظیم کا یہ آرگن ہے، وہ اس لحاظ سے واحد مثال ہے کہ ٹریڈ یونین کے طرز پر محض معلمین کے حصولِ حقوق کی جد و جہد کرنے کے بجائے خاصا زور تعلیمی میدان میں تحقیق و تصنیف پر صرف کرتی ہے تاکہ کارپردازانِ تعلیم، نصاب سازوں، نصابی کتابیں لکھنے والوں اور پروفیسروں اور معلمین کو یہ رہنمائی حاصل ہوتی رہے کہ اسلامی نقطۂ نظر سے ہمارے موجودہ نظام اور طرزِ فکر اور طریقِ تعلیم میں کیا کیا خرابیاں قابلِ اصلاح ہیں اور رُوحِ تعلیم اور مقصدِ تعلیم سے لے کر تعلیم کاری کے مختلف پہلوؤں میں اسلام کے کن اہم تقاضوں کو غالب ہونا چاہیے۔

اس اشاعتِ خاص میں ڈاکٹر معین الدین عقیل، پروفیسر زین العابدین، پروفیسر عظمت اللہ خاں، جناب محمد صدیق۔ پروفیسر مسلم سجاد، ڈاکٹر حفیظ الرحمٰن، پروفیسر خورشید احمد، ڈاکٹر خالد علوی، پروفیسر سید محمد کاظم، ڈاکٹر سید محمد باقر، مولانا عبدالماجد دریا آبادی (مرحوم) ڈاکٹر احمد خان،

مشہور اسلامی صحافی محمد صلاح الدین (مدیر تکبیر) مولانا سید ابوالاعلیٰ مودودی (رحمہ اللہ) کی بصیرت افروز نگارشات کے ساتھ ایک معمولی سی تحریر راقم کی بھی شامل ہے۔

اِس مجلّہ، خصوصاً اس کی اشاعتِ خاص کو ماہرینِ تعلیم اور معلمین تک پہنچنا چاہیے اور یونیورسٹیوں اور کالجوں اور دیگر درس گاہوں کی لائبریریوں میں اسے موجود ہونا چاہیے۔

ہمقدم (سالنامہ) | مرتب: اختر عباس - دفتر: ۱۔ اے ذیلدار پارک، اچھرہ - لاہور۔

بڑے سائز کے ۴۸۴ صفحات - قیمت: ۱۸/- روپے چندہ سالانہ ۴۵/- روپے

اسلامی جمعیت طلبہ کے نوجوانوں نے اس کا آغاز ۱۲ سال پہلے کیا تھا۔ جب کہ جمعیت کے نوجوان آزمائشوں کی چکیوں میں پسنے کے بعد بھی معرضِ آزمائش ہی میں ہیں۔ ان کی ہمت قابلِ داد ہے کہ وہ کئی طرح کی خدمات انجام دے رہے ہیں۔ انہی میں جملہ ذہنی تعمیر کی ایک سعی ہمقدم کی صورت میں بھی جاری ہے۔

مضامین کی زیادہ تفصیل تو میں نہیں دے سکتا۔ البتہ یہ کہہ سکتا ہوں کہ رنگا رنگ تحریریں اس میں شامل ہیں۔ جمعیت کی تاریخ کی خاص خاص جھلکیاں بھی ہیں۔ تاریخِ مجاہدین کے حالات پر مشتمل ایک ناول کی قسط بھی، قرآن و حدیث کی تجلیات بھی، حالیہ زمانۂ آزمائش کے تجربوں کی روئیدادیں بھی ― کچھ بشکل رپورتاژ، کچھ بشکل فسانہ ― مقبوضہ کشمیر کی داستان کا ایک خون آلود ورق بھی۔ چوہدری غلام جیلانی کا ایک جامع مضمون جس میں تاریخ دستور سازی پاکستان میں مولانا مودودیؒ کا حصّہ نمایاں کیا گیا ہے۔ سید اسعد گیلانی صاحب کا ایک تازہ افسانہ بھی۔ ابتدا میں قائدِ تحریکِ اسلامی میاں طفیل محمد صاحب اور سیکرٹری جناب قاضی حسین احمد صاحب اور سابق ناظمینِ جمعیت کے پیغام درج کیے گئے ہیں۔ سابق ناظمین نے اپنے اپنے دَور کے خودنوشت جمعیتی احوال بالاجمال پیش کیے گئے ہیں۔ مزید برآں بزرگانِ دین کی شخصیتوں کی لمعاتی بھی اس سالنامے میں دیکھی جا سکتی ہے۔ منظومات بھی متعدد ہیں۔

ہمقدم (خصوصاً اس کا سالنامہ) اسلامی ادب و صحافت کے اچھے مستقبل کی امید دلاتا ہے۔ "ہمقدم" جن نوجوان سختی کشانِ عشق کی اپنی ہی کاوشوں سے اپنے وجود کو بہ حسن و خوبی برقرار رکھے

ہوئے ہے۔ اس کا یہ شاندار رسالنامہ دیکھ کر خیال آتا ہے کہ اگر معاشرے کے کارپردازوں کو مصلحتوں کے گردابوں سے نکل کر سوچنے کا موقع مل سکتا تو وہ اس نوجوان قوت کو کسی سیاسی سودا بازی کے بغیر اصلاح و تعمیر کے مواقع دے کر (مدد دے کر نہیں) نہ صرف تعلیم گاہوں کی فضا کو الحاد اور نفس پرستی اور اخلاقی بحران سے بچانے کا ذریعہ بنتے بلکہ مجموعی طور پر معاشرے کی فضا بھی ان کے کردار سے متاثر ہوتی ۔ لیکن شومئی قسمت اساتذہ اخلاقی قدروں سے تہی دامن طلبہ اور غنڈہ عناصر کی گروہ بندیوں کا مقابلہ کرنے کے ساتھ ساتھ جب اُن کو حکومت کی سخت گیر پالیسی کا نشانہ بھی بننا پڑا تو ان کے کیے ہوئے تعمیری کام کو اتنا نقصان پہنچا کہ اب تعلیم گاہوں میں لادینیت، مغربی ثقافت اور لڑکوں اور لڑکیوں کے اختلاط کی لہریں پہلے سے کہیں بلند ہو چکی ہیں۔

معلوم نہیں یونینوں کو ممنوع ٹھہرا کر ان فلاح پسند نوجوانوں میں نامطلوب ردعمل پیدا کرنے کی سعی کا خیال کس ذہن میں آیا؟ اب وہی ذہن یہ نتیجہ بھی نکالے کہ بھلا کس کا ہوا اور کس شکل میں ہوا؟ ـــــ اور کیا اب تعلیم گاہیں ہنگاموں سے پاک ہیں؟

یہ چند الفاظ ہم نے ان احساسات کو پڑھ کر لکھے ہیں جو سالنامے کے اداریے اور دوسری تحریروں میں منعکس ہیں۔

میرا البم | از جناب خرم جاہ مراد ۔ ناشر: حلقہ خواتین پاکستان (پتہ درج نہیں)، صفحات: ۲۴
قیمت: ایک روپیہ تبلیغ کے لیے فی سینکڑہ -/۵۰ روپے۔

ہر طرف تصویریں ہی تصویریں ہیں۔ مگر بعض تصویریں وہ ہوتی ہیں جنھیں آدمی دل میں اُتار کر اپنے لیے ایک روحانی البم تیار کرتا ہے۔ مراد صاحب حمدِ خدا کے بعد لکھتے ہیں کہ "سب سے خوبصورت، دلآویز اور دلربا تصویر ایک اچھے انسان کا اچھا اسوہ ہے"۔ دراصل خرم جاہ مراد کا البم حضور نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم ہی کی مختلف تجلیات کا آئینہ دار ہے۔ جو واقعات و حوادث کے بدلتے ہوئے پس منظروں میں ظاہر ہوتی رہیں۔ نہ صرف زورِ حکمت و ادبیت بلکہ ایمان و الٰہیت کی گرمی بھی اس مختصر سے رسالے میں نمایاں ہے۔ خوش نصیبی ہے کہ آدمی ایسی چیزوں سے استفادہ کرے،

خصوصاً طلبہ اور خواتین!

۱۔ اسلامی ریاست کے اساسی اصول و تصورات	اول الذکر از مولانا سید داؤد غزنوی مرحوم
۲۔ اسلام کی حکومتِ صالحہ اور اس کی ذمہ داریاں	ثانی الذکر از شیخ الحدیث مولانا محمد اسمٰعیل مرحوم

ناشر: مکتبہ نذیریہ۔ چناب بلاک، علامہ اقبال ٹاؤن، لاہور ۱۸ - قیمت (۱) -/۶ روپے (۲) -/۹ روپے۔

خدا ہر دو مؤلفین کی ارواح پر رحمتیں نازل کرے۔ ان حضرات نے عمر بھر علمی خدمات کے علاوہ اس معرکہ آرا دور میں اسلام کے حق میں بڑا کام کیا جب مغرب زدہ طبقوں نے تشکیل پاکستان کے بعد گراں قدر دینی مفکرین کے اندیشوں کے مطابق سیکولر ریاست کے قیام کے لیے پورا زور صرف کر دیا۔ یہاں تک قرارداد مقاصد پاس ہوئی۔ یہ دونوں علمی مقالات اس دور کی یادگار ہیں، اگرچہ لادینیت پسندوں کے تازہ تر بھاری حملے اور اس کے دوران میں اٹھنے والی بحثوں کے لحاظ سے نئے کام کی ضرورت ہے، مگر ان پمفلٹوں میں قرآن و حدیث سے جو روشنی اخذ کر کے پیش کی گئی ہے اس سے ہم کبھی بے نیاز نہیں ہو سکتے۔

۱۔ گھر کا چراغ ۲۔ امام احمد بن حنبلؒ ۳۔ امن کی راہ	مولف و ناشر: کمال عثمانی - امیر حزب اللہ۔ توحید روڈ، کیماڑی، کراچی۔ حزب اللہ کا تمام لٹریچر مفت تقسیم کیا جاتا ہے اور ہر کسی کو شائع کرنے کی اجازت ہے۔

کراچی میں آج کل ڈاکٹر عثمانی کے دم سے عقیدہ توحید پر بحث و تنقید کا ایک سلسلہ چل رہا ہے۔ خصوصاً یہ مبحث مرکز توجہ بنا ہوا ہے کہ عذابِ قبر کہاں ہوتا ہے اور کیسے؟ ڈاکٹر عثمانی صاحب نے برزخی جسم اور برزخی قبر کی اصطلاحات کے ذریعے اپنا مدعا واضح کیا ہے۔ دوسری طرف سے تردیدی لٹریچر شائع ہو رہا ہے۔ ہمارا کام دونوں میں محاکمہ کرنا نہیں ہے۔ بس ہمارا مشورہ تمام

خادمانِ ملت کی خدمت میں یہ ہے کہ وہ دین کی بڑی بڑی حقیقتوں کی زد میں آنے والے بڑے بڑے فتنوں کو ایک طرف چھوڑ کر غالب توجہ ایسے جزئیات اور خاص طور پر متشابہات پر صرف نہ کریں جن کا کبھی کوئی حتمی فیصلہ ہونا ہی مشکل ہے۔ خاص طور پر ملحدانہ نظریات اور مادہ پرستانہ تہذیب کے حملۂ شدید کو سامنے رکھا جائے۔

الدین الخالص | از ابوجابر عبداللہ دامانوی۔ ناشر: حزب المسلمین، فاروق اعظم روڈ، کیماڑی، کراچی۔ صفحات: ۱۷۶ قیمت: ۱۳/۵۰ روپے

یہ کتاب بھی ڈاکٹر عثمانی صاحب کے بعض خیالات کی تردید میں لکھی گئی ہے۔ بڑا معرکہ ڈاکٹر صاحب کے رسالہ "عذاب قبر" کی اشاعت سے شروع ہوا۔ ڈاکٹر صاحب کی اصل دعوت تو توحید اور ردِ شرک کی تھی۔ ضمناً قبروں اور آستانوں کا قصہ چھڑا۔ پھر عذابِ قبر کی بحث اُٹھی۔ ایک متشابہ امرِ غیب سے متعلق سلسلۂ بحث دراز ہوا اور اس میں تشدد پسندانہ رنگ بھی پیدا ہوا۔ اس رسالے میں الزام یہ لگایا گیا ہے کہ "عذابِ قبر"، "حیات فی القبر"، "اعادۂ روح الی القبر" اور "سماعِ موتیٰ" وغیرہ مسائل پر ڈاکٹر صاحب نے لوگوں کو مشرک کہنا شروع کیا۔ حتیٰ کہ امام احمد بن حنبلؒ، امام ابن تیمیہؒ، حافظ ابن قیم، حافظ ابن کثیر، ابن حجر عسقلانی تک کو بھی ہدف بنایا گیا۔ عثمانی صاحب کا مسلک یہ ہے کہ ان کی تعریف کے مطابق شرک کوئی بھی کرے وہ مشرک ہے۔

اُمت جن عظیم تر مصیبتوں اور فتنوں سے دوچار ہے، ان کے ہوتے ہوئے ان بحثوں کو پڑھ کر اذیت محسوس ہوتی ہے، مگر ایک ضمنی افادیت بھی ہے۔ دونوں طرف آیات قرآن اور سنتِ رسولؐ، ارشاداتِ صحابہ اور افکارِ محدثین و فقہاء کے اقتباسات نظر سے گزرتے ہیں۔ اگر تشتت و تحزب اور تصادم و تشدد کے غبار سے بچ کر اصل جواہر پاروں سے استفادہ کیا جا سکے تو اچھا ہو گا۔

تفہیم القرآن

اسپیشل سیٹ

تیار ہو کر مارکیٹ میں آ گئے ہیں۔ تاجران کتب اور قارئین کرام اپنی مطلوبہ تعداد کے لیے پہلی فرصت میں اپنے آرڈر سے مطلع فرمائیں۔

ھدیہ جلد دوم ——— ۷۲/- روپے

ھدیہ ——— ۵۰۰/- روپے

مجلد سنہری ڈائی

ادارہ ترجمان القرآن لمیٹڈ لاہور

رحمٰن مارکیٹ۔ غزنی سٹریٹ۔ اردو بازار

تلخیص تفہیم القرآن

جس کو مولانا صدرالدین صاحب اصلاحی نے

سیّد ابوالاعلیٰ مودودی

کی اجازت سے مرتب کیا ہے

اور ایک جلد میں پوری تفسیر کی تلخیص کی ہے مع عربی متن اور ترجمہ

مرکزی مکتبہ اسلامی دہلی نے شائع کی ہے

اس کی طباعت واشاعت کا حق **اِدارۂ ترجمان القرآن**

نے حاصل کیا ہے۔ بہترین جلد بندی اور اعلیٰ کاغذ پر ادارہ ترجمان

طبع کرا رہا ہے۔ صفحات : ۱۱۷۵

عربی متن کے نیچے تفہیم القرآن اور حاشیہ میں تفہیم کی تلخیص ہے جس کو

بڑی خوبی اور عرق ریزی سے مولانا صدرالدین صاحب نے مرتب کیا ہے۔